ذوق ②

سرپرست

محسن عباس

سید نصرت بخاری
ارشد سیماب ملک
حسنین امجد

ذوق پبلی کیشنز، اٹک

معیاری ادب کا ترجمان

جنوری ۲۰۱۹ء کا یہ شمارہ خوب صورت سر ورق کے ساتھ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت تین سو روپے ہے۔ اس میں سیماب صاحب کا تحریر کردہ مضمون "اردو جریدہ نگاری اور تاریخ ساز رہنمائے تعلیم" ایک قابل قدر مضمون ہے جس میں گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصہ سے شائع ہو رہے۔ اس رسالہ اور اُن کے بانی مدیر ماسٹر جگت سنگھ اور فرزند برجگن سنگھ تھاپر کے بارے میں اچھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ باقی مضامین بھی اپنے موضوعات کے حوالے سے معیاری ہیں۔ اس کے علاوہ ممتاز افسانہ نگار محمد حمید شاہد سے لیا گیا سید نصرت بخاری کا انٹرویو "فکشن کے باب میں ایک مکالمہ" بھی قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتا ہے اور اس کے مطالعے سے محمد حمید شاہد صاحب کے افسانوی فن اور فکشن سے متعلق اچھی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ یہ مکالمہ فکشن کو سمجھنے اور اس کے طالب علموں کے لیے راہ مشعل ہے۔

۔۔۔رسالے کی اٹھان بہت اچھی ہے۔

نند کشور وکرم

ذوق پبلی کیشنز، اٹک

ذوق (2) اٹک

(کتابی سلسلہ)

اپریل2019

سرپرست: محسن عباس

مدیرِ اعلیٰ:

سید نصرت بخاری

(03225016121)

snusratbukhari@hotmail.com

مدیر:

ارشد سیماب ملک

(03315130899)

malikarshadak@yahoo.c

معاون مدیر:

حسین امجد

(03134749191)

مجلس مشاورت: خالد خان ، اعجاز خان ساحر ، پروفیسر نثار احمد

پتا: سید نصرت بخاری، کامرہ کلاں، ضلع اٹک

ارشد سیماب ملک، النور پلازہ، بالمقابل گلی الائیڈ بنک، اٹک شہر

قیمت: 300

ذوق پبلی کیشنز، اٹک

فہرست

اداریہ (1)

مجھے شعر گوئی کا اپنا وہ ابتدائی زمانہ اچھی طرح یاد ہے جب اساتذہ کے ہاں میرے لکھے ہوئے خام اشعار اور ناپختہ تحریر کو تسلیم کر لیا جاتا۔ میرے سینئر میری حوصلہ افزائی کے لیے مجھے داد دیتے تو میں کئی کئی روز سرشار رہتا؛ آگے بڑھنے کا حوصلہ مجھ میں سرایت کر جاتا۔ میں سوچتا ہوں اگر میری حوصلہ افزائی نہ کی جاتی؛ میری ناپختہ تحریروں اور خام اشعار پر دادو تحسین کے چھینٹے نہ پڑے ہوتے تو میں نے علم و ادب کے میدان سے ہمیشہ کے نکل جانا تھا۔ ایک میں ہی کیا اگر علامہ اقبال، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی عبدالحق، ابوالکلام آزاد، فیض احمد فیض، مالک رام، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ، افتخار عارف وغیرہ بھی ابتدائی حوصلہ افزائی کی نعمت سے محروم ہوتے تو آج دنیا اُن کے لکھے ہوئے سے مستفید نہ ہو رہی ہوتی؛ اس لیے ضروری ہے کہ نو آموز لکھاریوں کی ہر سطح پر حوصلہ افزائی کی جائے۔ ان کے لکھے ہوئے کو سراہا جائے۔ جہاں ضرورت محسوس ہو وہاں مناسب انداز سے ان کی راہ نمائی اور اصلاح کی جائے۔ ان کی نگارشات پر منفی تنقید کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ کیا آپ کی ابتدائی تحریر بھی ایسی ناپختہ اور کم زور نہیں تھی؟ بڑے بڑے نام ور ادیبوں کی ابتدائی تحریریں ایسی ہی کم زور ہوتی ہیں؛ اسی لیے جب اُن کے نظم و نثر کے مجموعے شایع ہوتے ہیں تو اُن میں ابتدائی دور کی تحریریں شامل نہیں کی جاتیں۔

نئے لکھاری پنیری کی طرح ہوتے ہیں، ان کو کچلنے کی بجائے باغ باں کی طرح ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس میں اُن کا بھی بھلا ہے اور اساتذہ کی بقا بھی اِسی میں ہے۔ یہی لوگ آگے چل کر اساتذہ کے نام لیوا ہوں گے۔ آج اگر میر، غالب، انیس، حالی، سرسید، اقبال، شبلی ، فیض، حسن عسکری، سید عبداللہ شاہ، غلام عباس، عصمت چغتائی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے وغیرہ کا نام اور کام زندہ ہے تو اِس میں اُن کے کام سے زیادہ میرے جیسے طالب علموں کا زیادہ حصہ ہے

جو نہ صرف اُن کے نام لیوا ہیں بلکہ ان کی تحریروں کے نئے نئے زاویے اور مفاہیم بیان کر کے اُن کے لکھے ہوئے کی افادیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ایک لمحے کے تصور کیجیے کہ اگر مندرجہ بالا اساتذہ کو طالب علم اور نو آموز ادیب میسر نہ ہوتے تو اُن کا شعری و نثری سرمایہ ہمارے عہد تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔ یہ تو چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ ہے۔آپ ایک نو آموز کی حوصلہ افزائی کر کے اسے میدانِ علم و ادب میں اپنی جگہ بنانے کا موقع فراہم کرتے ہیں تو گویا آپ نے ایک چراغ روشن کر لیا جس کی روشنی میں آپ کے خدوخال ہمیشہ نظر آتے رہیں گے۔اس طرح میرے نزدیک جتنی اہمیت اساتذہ کی ہے اتنی ہی اہمیت نئے ادیبوں کی بھی ہے۔مجلہ "ذوق" کی انتظامیہ نئے لکھاریوں کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتی ہے اور "ذوق" کی صفحات میں انھیں خوش آمدید کہتی ہے۔ہم اپنا معیار برقرار رکھتے ہوئے اساتذۂ فن کے ساتھ ساتھ انھیں بھی چھپنے کا موقع فراہم کریں گے۔

مدیر اعلیٰ

سید نصرت بخاری

اپریل 2019

فروری میں خطہ کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال نے ہر ذی شعور کو ذہنی اضطراب میں رکھا ۔اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ ازل ہی سے طاقتور قوتیں اپنی طاقت کے نشے اور ہم خیال ملکوں کی بیک ڈور ڈپلومیسی کے ذریعے اپنے سیاسی ،معاشی ، مذہبی ،لسانی اور عسکری مفادات کے لیے انسانیت کو کچلتی آئیں ہیں بل خصوص لسانی و مذہبی منافرت کا بیج معاشروں میں بویا جاتا رہا اور پھر اسی کی آڑ میں انسانیت کو کچلا جاتا رہا۔ فلسطین سے لے کر کشمیر اور پھر روہنگیا سے یورپ تک کی حالیہ صورتِ حال اسی کا شاخسانہ ہیں ۔ جنگ عظیم اول سے لے کر حال تک کی شکست و ریخت میں انسانیت اور اخلاقی اقدار ہی زوال کا شکار رہیں ۔اگر انسانی حقوق کے دعویدار ہی انسانی حقوق کی پامالی کے مرتکب ہوں تو پھر معاشروں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ بہر حال موجودہ صورتِ حال اس بات کی متقاضی رہی ہے کہ نام نہاد سیاسی ایجنڈوں اور صحافتی اقدار کے اصولوں کے منافی ایسے رویوں کی ہمیشہ مذمت کی جانی چاہیے جو خطہ کے امن کو سبوتاژ کرے اور نسلِ آدم کو ہیجان میں مبتلا کر دے کیوں کہ ایسے میں بہ حیثیت صحافی و ادیب ہماری ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں ۔

ذوق کی پہلی اشاعت کو بے حد سراہا گیا جس سے حوصلہ ملا۔ ہماری کوشش ہے کہ ذوق کی بروقت اشاعت کو یقینی بنایا جائے ۔ہم اپنے عزم پر کاربند رہنے کی بھر پور کوشش کریں گے۔لیکن ادبی حلقوں کو رسائل کی مجبوریوں اور مسائل کا ادراک ہونا از حد ضروری ہے بل خصوص ذمہ دار اور سنجیدہ ادبی حلقوں پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مضافات سے اشاعت آشنا ہونے والے ادبی جریدوں پر بھی اتنی ہی توجہ مرکوز رکھیں جتنی کہ مرکز سے شایع ہونے والے جریدوں پر۔ کیوں کہ ادبی جرائد کے معیار اور تسلسل کا قائم رہنا انھی سنجیدہ ادبی حلقوں کی مرہونِ منت ہے۔بعض اوقات ہمیں اکثر رسائل میں میں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ رسالہ کا قد کاٹھ بڑھانے کے لیے نامی شعراء و ادباء کی مطبوعہ تخلیقات کو کتابوں

،رسائل اور شوشل میڈیا سے اٹھا کر شاملِ اشاعت کر لیا جاتا ہے جو ادبی جرائد کے اشاعتی اصولوں کے منافی ہے اور ہم ایسے رویوں کی سخت مذمت کرتے ہیں۔ سنجیدہ ادبی حلقوں سے بھی یہ توقع رکھتے اور درخواست کرتے ہیں کہ رسائل و جرائد کو اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات ہی ارسال فرمائی جائیں۔

اس بار ذوق میں خطوط کے گوشہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یوں تو مکتوب نگاری کی روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے لیکن اردو میں مکتوب نگاری اٹھارویں صدی عیسوی سے قبل رواج پا چکی تھی۔ غلام غوث بے خبر اور رجب علی بیگ سرور کو اردو کے اولین مکتوب نگار کی حیثیت سے اہمیت دی جاتی ہے لیکن بعض محققین کے نزدیک ان سے بہت پہلے اردو مکتوب نگاری کی روایت کا آغاز ہو چکا تھا تاہم مرزا اسد اللہ خان غالب نے اپنے دلکش اور خوب صورت اندازِ بیان سے مکتوب نگاری کو اک نئی طرزِ تحریر سے روشناس کرایا۔ اردو ادب میں عودِ ہندی، اردوئے معلیٰ اور مکاتیب غالب کو خاص اہمیت رہی۔ اس کے بعد سے سرسید احمد خان، مولانا حالی، مولانا آزاد اور ان ایسے کئی مشاہیر ادب کے مجموعہ ہائے مکاتیب نے مکتوب نگاری کی صنف کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ آج سائنس کی جدت کاری سے مکتوب نگاری کی یہ عظیم اور خوب صورت روایت معدوم ہوتی جا رہی ہے جو ایک لمحہ فکریہ ہے! احمد داؤد کسی تعارف کے محتاج نہیں ان کا تعلق اٹک سے تھا اور اردو افسانہ میں عالمگیر شہرت کے حامل افسانہ نگار تھے۔ انڈو پاک کے ممتاز شخصیات سے ان کے روابط رہے۔ انھی کے نام چند شخصیات کے خطوط کو اس گوشہ میں جگہ دی گئی ہے۔ انشاء اللہ ذوق آپ کے تعاون سے ادب کے معیارات پر پورا اترنے کی کوشش جاری رکھے گا۔

مدیر: ارشد سیماب ملک

جمشید اقبال

نعت

اکرامِ محبت کے ہیں آداب مرے خواب
آقا سے قرابت کے ہیں اسباب مرے خواب

ہیں حضرتِ اقدس کی محبت کا خزانہ
یہ وادیِ الفت کے حسیں باب مرے خواب

حضرت کی محبت میں ڈُھلے ،نکھرے ہوئے سے
دیکھیں تو ذرا غور سے احباب مرے خواب

وابستہ رہے جو مرے آقا سے ہمیشہ
کر دیں گے مری ذات کو شاداب مرے خواب

اُس شہر مقدس پہ ہو قربان مری جان
اس شہر میں ہو جائیں گے سیراب مرے خواب

چمکیں گے صدا میرے مقدر کی زمیں پر
حضرت سے ملاقات کے مہتاب مرے خواب

جمشید یہ چھوڑیں گے تجھے جا کے مدینے
تقدیرِ محبت کے ہیں گرداب میرے خواب

ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

نعت

بہ صد کمال و محبت یہ اہتمام کھلا
سخن مرا پئے مدحِ شہِ تمام کھُلا

کھلی تجھی پہ حروفِ مقطّعات کی رمز
ترے سوا نہ کسی پر یہ سب کلام کھُلا

وجودِ وجہٗ دوعالم کی سیر ختم ہوئی
تو بابِ ہست کا پھر جا کے انتظام کھُلا

ہزاروں سال ریاضت میں کٹ گئے پھر بھی
کسی کسی فَرَشِ دل پہ اُن کا نام کھُلا

میں بالیقیں صفِ اوّل میں پایا جاؤں گا
دریچہ خلد میں جب بھی پئے سلام کھُلا

ہے بند ہونا ہی آخر ہر ایک در کا نصیب
رہے گا در تری رحمت کا پر مدام کھُلا

کسی کو جلوۂ رب دیکھنے کی تاب نہ تھی
یہ در کھُلا تو برائے شہِ انام کھُلا

خدا ہی جانے تُو کیا ہے، ترا مقام ہے کیا

کسی بشر پہ نہ تیرا کوئی مقام کھُلا

نبی کی شان میں گستاخی جو کریں دانش !
تو اُن سے لیتا ہے اللہ انتقام کھُلا

محمد عارف قادری

دہلیز پہ گدا کو بلانے کا شکریہ
سرکار اپنا دیس دکھانے کا شکریہ

یہ دل وگرنہ خانۂ ویران ہی تو تھا
اپنی وِلا سے اس کو بسانے کا شکریہ

اب میں ہوں اور سایۂ لطفِ شۂ امم
احباب کو سلام،زمانے کا شکریہ

اے چشمِ مصطفیٰ ترے فیض و اثر کی خیر
کج فہم دل کو راہ پہ لانے کا شکریہ

قربانیوں سے جن کی مسلمان آج ہم
واجب ہے پنج تن کے گھرانے کا شکریہ

میرا غریب خانہ کہاں اورکہاں حضورؐ
کیسے ادا ہو آپ کے آنے کا شکریہ

ٹھہری مری نجات کا ساماں نبیؐ کی نعت
ایسی سبیل ایسے بہانے کا شکریہ

دل کا قرار عارفِ بے کل نے پا لیا
یارو نبیؐ کی بزم سجانے کا شکریہ

محسن عباس

نذرانۂ عقیدت بہ حضور شہزادیِ کونین حضرت فاطمہؑ

جہانِ عصمت و عفت الگ بسایا گیا
اور اس کے تخت پہ زہراؑ کو پھر بٹھایا گیا

وہ شاہ زادی وہ ملکہ شرف کی دنیا کی
وہ جس کا ہم سرو ہم دم علیؑ بنایا گیا

مقام اتنا مقدس ہے پاک بی بی کا
کہ بس وہ آپ کے بابا کو ہی بتایا گیا

طہارتوں کا ہے قرآن سیدہ زہرا
کہ جزوِ قلبِ محمدؐ جسے بنایا گیا

حبیب! بیٹی کے ہاں اذن لے کے جایا کرو
یوں شانِ فاطمہ کا شائبہ دکھایا گیا

نظامِ ہستی تھا تاریکیوں میں ڈُوبا ہوا
جو نور بنتِ محمدؐ سے جگمگایا گیا

وہ فاطمہ کا جو گھر ہے تمھارا کعبہ ہے
سب عرشیوں کو یہ باقاعدہ بتایا گیا

اسی وسیلے سے لطفِ خدا ہوا جاری
انھی کے ہاتھوں شفاعت کا دھن لٹایا گیا

اعجاز خان ساحر

بحضورِ امامِ عالی مقام

میری چشمِ تر میں جو درد کا کبھی سیلِ اشکِ رواں رہے
مرے خون میں مری سانس میں ترے عشق کا ہی بیاں رہے

مجھے حُر کے بخت پہ رشک ہے جو صفِ عدو سے نکل گیا
اُسے وصف ایسا عطا ہوا ترے دشمنوں پہ گراں رہے

وہ جلے جلے سے خیام جو مری چشمِ تر کے ہیں سامنے
وہی سسکیاں وہی آہٹیں وہی سوچ میں بھی دھواں رہے

چلی تیغ گردنِ شاہ پرتو تھا حالِ سجدہ میں ان کا سر
سنی آسماں نے یہی صدا میرے مولا تری اذاں رہے

یہ ترے عدو کا نصیب تھا یہ ترے عدو کا نصیب ہے
کہ وہ دو جہاں میں سکون سے نہ یہاں رہے نہ وہاں رہے

جو بریدہ بازو ہوئے تو کیا صفِ دشمناں کو خبر کرو
یہ علم ہے میرے عباس کا دمِ حشر تک یہ نشاں رہے

اے فرات تجھ سے ہے کام کیا تو رواں رہے نہ رواں رہے
دمِ آخرت یہی آرزو تیرے ساحرِ بے نوا کی ہے

تری یاد دل میں مکین ہو ترا نام وردِ زباں رہے

مشتاق عاجز

غزل

لکھتا ہوں بہت، لکھ کے پریشان بہت ہوں
بے فیض مساعی پہ پشیمان بہت ہوں

اِک عمر میں اِک شخص کو پہچان نہ پایا
یوں جانیے سب جان کے انجان بہت ہوں

سادہ سی پہیلی ہوں مجھے بوجھنے والو
بس ایک ہی مشکل ہے کہ آسان بہت ہوں

داناؤں کی دنیا میں بھلا کیسے بسر ہو
یاروں کا یہ کہنا ہے کہ نادان بہت ہوں

جینے کا سلیقہ بھی نہ تھا اور جیا بھی
جینے کی جسارت پہ میں حیران بہت ہوں

فضل حسین صمیم

سرخوشی میں جب بہکتی ہے چمبیلی رات کی
گونج اٹھتی ہے چھناکے سے حویلی رات کی

کھڑکیاں دو، سسکیاں سو، کرب کا پچھلا پہر
چاندنی رونے لگی سن کر پہیلی رات کی

تھا مزارِ ہجر پر جلتے دیوؤں کی لو کا رقص
صبح تک روشن رہی کیسے ہتھیلی رات کی

بات کچھ تو ہے جو تجھ سے صبح تک روٹھی رہی
نیند تیری آنکھ کی تیری سہیلی رات کی

وصلِ صبح و شام مشکل دو کناروں کا ملاپ
میں ہوں اپنے دن کا تنہا تو اکیلی رات کی

زندگی! تیرے سفر میں، آج تک بھولا نہیں
اپنے گاؤں کا سٹیشن وہ ڈومیلی(۱) رات کی

اس بھنور میں ساتھ اپنے کون اترے گا صمیم
ایک اپنی مے کشی ہے یار بیلی رات کی

۱۔ جہلم کی تحصیل سوہاوہ کے گاؤں چوکوہا (میری والدہ محترمہ کا گاؤں) کے قریب ڈومیلی نام کا اپنی ساخت میں ایک طلسماتی ریلوے سٹیشن۔

فرخ ہمایوں

جو کھٹکھٹا کے دریچے ہوا گُذرتی ہے
یہ دِل ہی جانتا ہے دِل پہ کیا گُذرتی ہے

شبِ فراق سے کہ دو کہ بیت بھی جائے
ستا ستا کے ہمیں کیوں بَھلا گُذرتی ہے

درخت خاک بہ رُخ، بلبلیں ہیں نالہ بلب
خزاں نصیب چمن سے صبا گُذرتی ہے

جنوں کے دائرۂ بےجہت میں رہتا ہوں
نہ اِبتدأ نہ کوئی اِنتہا گُذرتی ہے

وُجودِ عشق قیامت ہے، نارِ محشر ہے
یہ آہ کر کے دِلوں کو فنا گُذرتی ہے

وفا کے دیپ ہیں روشن وہاں وہاں فُرخ
جہاں جہاں سے بھی راہِ وفا گُذرتی ہے۔

سیدنور جہاں

ہر طرح سے سجائی جاتی ہوں
جیسے دلہن بنائی جاتی ہوں

وصل بہتا ہے زور وشور کے ساتھ
میں اسی میں نہائی جاتی ہوں

میں کوئی چیز ہوں بہت نایاب
ہر کسی سے چھپائی جاتی ہوں

اور کچھ بھی نہیں مرا مصرف
دیکھی جاتی، دکھائی جاتی ہوں

کوئی کرتا نہیں یقین مرا
میں بہت آزمائی جاتی ہوں

بارشِ رنگ و نور ہوتی ہے
میں تو جیسے نہائی جاتی ہوں

جبّار واصف

کبھی زمین، کبھی آسماں سے لڑتا ہے
عجیب شخص ہے سارے جہاں سے لڑتا ہے

کسی کے عشق کی مَنّت کا تیل ہے اِس میں
اِسی لئے تو دِیا آستاں سے لڑتا ہے

ہمیں یہ بانجھ بَہُو بے نشان کر دے گی
یہ بات کہ کے وہ بیٹے کی ماں سے لڑتا ہے

کرائے دار کی نیند اِس قدر پریشاں ہے
وہ روز خواب میں مالک مکاں سے لڑتا ہے

یہ کس کے قرض کا ہے بوجھ میری میّت پر
یہ کون ہے جو مرے خانداں سے لڑتا ہے

دُعا ہے خیر ہو اُس گھر کی جس میں رو رو کر
کوئی بزرگ کسی نوجواں سے لڑتا ہے

بس ایک خاص نشانی ہے میرے مدفَن کی
کہ اُس مکاں میں کوئی لامکاں سے لڑتا ہے

بڑے یقین سے کچھ بے یقین مانگتے ہیں
وہ اِک یقین جو وہم و گماں سے لڑتا ہے

اذان دیتا ہوں جب میں سُخَن کی مسجد میں
ہر ایک بے نَوا میری اذاں سے لڑتا ہے

میں اپنے عہد کا واصفؔ ہوں اور شاعر ہوں
زمانہ کس لئے مجھ ناتواں سے لڑتا ہے

علی ارمان

مرے دکھوں کو سمجھتے ہیں درد جانتے ہیں
چراغ اب مجھے گھر ہی کا فرد جانتے ہیں

ہمارا ہجر نہیں جانتا زمیں پہ کوئی
یہ مہر و ماہ یہ گل ہائے زرد جانتے ہیں

وہ کائناتِ مکمل کی داد کیا دیں گے
جو اس غزل کو ابھی فرد فرد جانتے ہیں

ہم ایسے گریہ مزاجوں کا کیا کیا جائے
جو ہر ستارے کو اک آہِ سرد جانتے ہیں

بنایا جاتا ہے کس طرح ریت سے پانی
یہ راز چند ہی صحرا نورد جانتے ہیں

ترے دوانوں کو کچھ اور علم ہو کہ نہ ہو
اڑائی جاتی ہے کس طرح گرد جانتے ہیں

ہماری شعلگی سب مرحلوں سے واقف ہے
ہم اس زمانے کے سب گرم و سرد جانتے ہیں

انھیں میں کس طرح سمجھاؤں پیڑ ہوں میں بھی
درخت مجھ کو کوئی بارِ دگر جانتے ہیں

کھلا ہے کشمکشِ ہجر و وصل سے عالم
ہے ذرے ذرے میں نورِ نبرد جانتے ہیں

اسد رحمٰن

ماحول اس طرح کا تھا دربار اور تھا
میں جس پہ اَڑ گیا تھا وہ انکار اور تھا

پہلے کچھ اور بات تھی اب جاگتے رہو
پچھلے سفر میں قافلہ سالار اور تھا

میں پھر بھی بِک گیا تھا مثالِ پیمبراں
گرچہ یہ جنس اور تھی بازار اور تھا

لوگوں کو باہر آ کے بتایا گیا کچھ اور
ورنہ تو واقعہ پسِ دیوار اور تھا

میرے بدن میں موج زن اک اور لہر تھی
جو رقص ہو رہا تھا سرِ دار اور تھا

سب کو اسد ہرا کے جو دیکھا درونِ ذات
اک شخص مجھ سے برسرِ پیکار اور تھا

سجاد بلوچ

دریدہ ایسے ہوئے عمر بھر سِلے نہیں ہم
یہ کیا ہوا کہ تمھیں مل کے بھی ملے نہیں ہم

گلاب تھے کسی صحرا مزاج موسم کے
تمہارے خواب کے اطراف میں کھِلے نہیں ہم

یہ کیا ہوا تمھیں تم تو پہاڑ جیسے تھے
یہ دیکھ ہم کو جڑوں سے ذرا ہلے نہیں ہم

ملے ہیں ورثے میں کچھ خواب، کچھ جلے خیمے
کسی محل کی روایت کے سلسلے نہیں ہم

زمیں کی تہ میں کہیں دور دفن ہو گئے تھے
تمہارے عہدِ خرابات میں مِلے نہیں ہم

خاور اعجاز

جو بنا اس سے سِوا بن جاتا
کاش مَیں حرفِ دعا بن جاتا

بس نہیں چلتا وگرنہ انساں
ایک لمحے میں خدا بن جاتا

کیوں اُڑایا مجھے بر دوشِ ہَوا
میری مٹی سے دِیا بن جاتا

دل کے ٹکڑے جو بچا کر رکھتے
آئنہ ایک نیا بن جاتا

میرے اجزا جو بہم ہو سکتے
جانے کس ذرّے سے کیا بن جاتا

صائمہ آفتاب

لڑکھڑا کے سنبھل رہے ہیں ہم
یعنی رستہ بدل رہے ہیں ہم

لاد کر دن کا بوجھ کاندھوں پر
چاندنی میں ٹَہَل رہے ہیں ہم

مثلِ گرد و غبارِ راہ سہی
دیکھیے! ساتھ چل رہے ہیں ہم

رنگ اُڑتے ہیں چار سَمتوں سے
خوشبوؤں سے بَہَل رہے ہیں ہم

کیا کہیں ، فاصلے پہ بیٹھے بھی
اک الاؤ میں جل رہے ہیں ہم

آپ نے حال ہی تو پُوچھا ہے
اور اشکوں میں ڈھل رہے ہیں ہم

دستیابی کی مت اذیت پوچھ
کفِ افسوس مَل رہے ہیں ہم

کس کا چھوڑا ہوا برتتے ہیں
کس کے ٹکڑوں پہ پَل رہے ہیں ہم

جون ہوتے تو سرزنش کرتے
ٹال دینے سے ٹل رہے ہیں ہم

اور فردا سے نا بَلَد ہے کون
اور کس کس کا کل رہے ہیں ہم

حسین امجد

ابر ،بارش کہ رنگ و بو ہیں حروف
شہد،شبنم کے ہو بہ ہو ہیں حروف

اس سے قائم ہے آب وگل کا نظام
نخل امید کی نمو ہیں حروف

خوابِ نادیدہ کی ہیں آہ و پکار
شہرِ مضطر کے کاخ وکو ہیں حروف

عمر بھر ان سے استفادہ کیا
شکر ہے میرے رو برو ہیں حروف

اسمِ احمد کی میم کے صدقے
دونوں عالم میں سرخرو ہیں حروف

ہم کہیں فخر سے حسین امجد
بزمِ یاراں کی آبرو ہیں حروف

معظم شاہ

ہم محبت کے اسیروں نے کہاں جانا ہے
اس کے کوچے سے کہیں اور گماں جاتا ہے؟

وقت کی گرد پہ قدموں کے نشاں بولتے ہیں
راستہ کون بدلتا ہے، کہاں جاتا ہے

ہم تو جنگل میں چھپے دیکھ رہے تھے اس کو
کس طرف کھیلنے وہ رشک بتاں جاتا ہے

میری مٹی نے بھی للکار کے دشمن سے کہا
ادھر آ، دیکھ، مرا شیر جواں جاتا ہے

احمد عقیل

تیرے بے ربط بیانات سے خوف آتا ہے
مجھ کو اب شہر کے حالات سے خوف آتا ہے

تُو تو کہتا تھا مدینے کی ریاست ہو گی
ان سنائے ہوئے نغمات سے خوف آتا ہے

اول اول میں سمجھتا تھا مسیحا تجھ کو
منصفا اب تری ہر بات سے خوف آتا ہے

ہم جنوں خیز مزاجوں کو نہیں تاب شعور
واعظ شہر کے خطبات سے خوف آتا ہے

ہاں مجھے گوشہ نشینی سے بہت الفت تھی
اب مگر شورش جذبات سے خوف آتا ہے

پہلے سنتا تھا بڑے شوق سے افسانہ مرا
اب اسے میری حکایات سے خوف آتا ہے

میری آنکھوں میں تلاطم، تری آنکھوں میں سکون
بس مجھے ایسے تضادات سے خوف آتا ہے

عبداللہ نعیم رسول

حسین زادی حسین وادی میں معتکف ہے
عجیب داسی ہے اپنے کیوپڈ سے منحرف ہے

فقط میں تیروسناں سے ملبوس ہی نہیں ہوں
مرا عدو بھی مری شجاعت کا معترف ہے

اسے خبر ہے جو ہو رہا ہے درونِ دنیا
اگرچہ برسوں سے ایک حجرے میں معتکف ہے

یہ کیسی دنیائے خود کلامی میں جی رہا ہوں
کہ ہر حقیقت مری خموشی سے منکشف ہے

شریر اور آتما کی جنگوں کا دور ہے یہ
یہ دور دیگر سبھی زمانوں سے مختلف ہے

سید حب دار قائم

جگر تیرے چھالے سنورنے لگے ہیں
پھر آنکھوں سے آنسو اترنے لگے ہیں

ابھی ان سے قسمت کی باتیں ہوئی تھیں
ابھی سے وہ پل میں بدلنے لگے ہیں

ابھی تو جمے تھے محبت میں پاوں
ابھی سے یہ پاوں اکھڑنے لگے ہیں

پری مہوشوں نے گلابوں کو سینچا
جبھی ان کے مکھڑے نکھرنے لگے ہیں

کہا بے وفا سے وفا مانگ کر یہ
تجھے ہم محبت سے تکنے لگے ہیں

زمانے نے جب سے جتایا ہے مجھ کو
پرانے تعلق مچلنے لگے ہیں

وہ باتوں سے قائم مری خامشی پر
وہ ناراض سے ہم کو لگنے لگے ہیں

عاطف مشتاق

کسی کے کوچے میں مدت سے آنا جانا نہیں
یہ اس لیے کہ اُدھر کا کوئی بہانہ نہیں

چمن کا کھلنا کسی کا جواز ہوتا ہے
کسی چراغ کا جلنا بھی غائبانہ نہیں

وہ دیکھ ٹوٹے ہوئے گھونسلے پہ اک پنچھی
بغیر گھر کے کسی کا کہیں ٹھکانہ نہیں

بلا جواز مروت نہیں ہے لہجے میں
بلا جواز یہ اندازِ دوستانہ نہیں

علی محمد فرشی

موت سے غیرِ قانونی معاہدہ

نظم مکمل ہوتے ہی
اُس نے سگریٹ سلگایا
اور دھوئیں کے مرغولوں میں
موت کا چہرہ تحلیل کرنے لگا
ایسے شاعر
لپک کر موت کی طرف بڑھتے ہیں
غیرت کے نام پر
کوئلہ ہو جانے والی دوشیزہ کی
پہلی بار آخری ڈولی اٹھانے کے لیے
انھیں تمباکو کے دھوئیں سے
بدبو نہیں آتی
اور نہ وہ
جلی ہوئی بس کے ڈھانچے سے

مسافروں کے سوختہ

ٹکڑے جمع کرتے ہوئے

دھواں دیتے خوابوں کا دُکھ

اپنی آنکھوں سے جدا ہونے دیتے ہیں

بارش میں رو لینے والا چارلی چپلن

دوسروں سے اپنے آنسو چھپا لیتا تھا

تا کہ خوشیوں سے انسانوں کا

اعتبار نہ اُٹھ جائے

جب کہ شاعر سسکیاں لے لے کر بین کرتا ہے

کہ لوگوں کو یقین آ جائے

زندگی کے دوزخ میں، وہ اکیلے نہیں ہیں

کہتے ہیں

ولی، مرنے سے پہلے کئی بار مرتا ہے

جب کہ شاعر تو جینے سے پہلے ہی مر جاتا ہے

اللہ کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ غم

کہ وہ تقدیر کے بلیک ہول میں

مستقل ٹھکانا بنا لیتے ہیں
لیکن شاعر کا اضطراب اُسے کہکشاؤں کے گرد باد میں
رے زہ رے کر دیتا ہے (ا)
اُس نے سگریٹ کا آخری کش لگایا
اور اُسے خودکشی کے دروازے سے باہر
پھینک دیا

(ا) خیال رہے کہ اِسے ریزہ ریزہ نہ کر دیا جائے۔ علی محمد فرشی

سعود عثمانی

سال نو 2019 کی پہلی رات / پہلا دن اور پہلی نظم ٹرین میں

افق پہ دھند، فضا میں دھند لکا، کھیت میں دھوپ
ہری زمین کٹی کھیتیاں، کھجوروں کے جھنڈ
کہیں کہیں کسی تالاب پر سفید پرند
ٹھہر ٹھہر کے یہ منظر گزرتا رہتا ہے
ٹرالیوں میں لدے پورے کھیت گنے کے
مٹھاس بیچتی ان تلخیوں کی لمبی قطار
گھنیرے پیڑ تلے خاک زاد دیواریں
اریبی راستہ، پگڈنڈی، نیم پختہ مکاں
یہاں وہاں کسی تندور سے نکلتا دھواں
یہ سب تھپے ہوئے اپلے، یہ سب لپے ہوئے گھر
زمانہ کب سے انہی مسکنوں میں ٹھہرا ہوا
حدودِ وقت سے باہر گزرتا رہتا ہے

گزشتہ سال کے ملبے سے پھوٹتا نیا سال

یہ سیل وقت ہے مجھ پر گزرتا رہتا ہے

یہ انتظار فقط کرب انتظار سعود

اس ایک لمس کی خاطر ترس گئیں پوریں

وہ لمس جو مجھے چھو کر گزرتا رہتا ہے

میں ایک تشنہ و بے آب دشت ہوں شاید

وہ دشت جس پہ سمندر گزرتا رہتا ہے

ساجد نظامی

کچھ خبر بھی ہے تم کو

ـــــ

کس طرح اچانک تم
چھوڑ کر ہمیں جاناں
سوئے خُلد جا نکلے
کچھ خبر بھی ہے تم کو
تیرے بِن یہ راہیں اب
اجنبی سی لگتی ہیں!

اقبال حسن آزاد: (انٹرویو)

اقبال حسن آزاد کا تعلق انڈیا سے ہے۔آپ نے کھگڑیا، بہار، (انڈیا) میں 26/جنوری 1955 میں سید محمد صالح مرحوم کے گھر میں آنکھ کھولی۔ ڈمراواں، بہار شریف ضلع نالندہ، بہار، انڈیا آپ کا آبائی علاقہ ہے۔ ابتدائی تعلیم لہیر یا سرائے، دربھنگہ، بہار، (انڈیا) سے حاصل کی۔ صغریٰ ہائر سیکنڈری اسکول، نالندہ، بہار، میں چھٹی جماعت تا دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ 1972ء میں رام موہن رائے سیمینری، پٹنہ، بہار، سے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا۔ 1975 میں بی۔اے کی سند کے حصول کے لیے، اردو آنرز مولانا آزاد کالج، کلکتہ، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ کا رخ کیا اور کامیاب ہوئے۔ 1977 میں پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ سے ایم۔اے اردو کا امتحان (فرسٹ کلاس) پاس کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ 1988ء میں" اردو نثر میں طنز و مزاح" کے عنوان پر تحقیق مقالہ لکھ کر بی، آر، اے، بہار یونیورسٹی، مظفر پور، بہار، سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 31/اگست 1981 کو ملازمت کا آغاز ہوا اور جے، آر، ایس، کالج، جمال پور، مونگیر، بہار، میں لیکچرر کی حیثیت سے پہلا تقرر رہوا۔ دمِ تحریر جے آر ایس کالج، جمال پور، مونگیر میں پرنسپل کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ سہ ماہی" ثالث" مونگیر کے مدیر (اعزازی) ہیں۔

مطبوعات:

قطرہ قطرہ احساس، مردم گزیدہ، اردو نثر میں طنز و مزاح کے عناصر، پورٹریٹ (افسانوی مجموعہ)

انٹرویو: اقبال حسن آزاد سوالات: سید نصرت بخاری

سوال: انڈیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اردو بول یا سمجھ نہیں سکتے؟

جواب: بے شمار۔ اردو بولنے کا چلن دھیرے دھیرے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی جگہ ہندی اور دوسری مقامی بولیوں نے لے لی ہے۔ اب یہاں لوگ ایسی زبان بولتے ہیں جو مختلف زبانوں کا ملغوبہ ہوتی ہے۔ اس بولی جانے والی زبان میں اردو اور ہندی کے عام فہم الفاظ اور انگریزی شامل ہے۔ فلموں میں بھی اب ایسی ہی بازاری زبان ملتی ہے؛ اردو گھرانے کے لوگ بھی اب خالص اردو نہیں بولتے۔ بنگال میں بنگلہ، مہاراشٹر میں مراٹھی، گجرات میں گجراتی تمل ناڈو میں تمل، اڑیسہ میں اڑیا، کیرالہ میں تیلگو، بہار اور یو پی میں بھوجپوری بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندی فلموں کے مکالموں اور گانوں سے بھی اردو غائب ہوتی جا رہی ہے۔ عام آدمی سے اس کا رشتہ کٹ چکا ہے۔

سوال: برصغیر کی وجہ سے عام طور پر اردو کو دنیا کی دوسری یا تیسری بڑی زبان سمجھا جاتا ہے۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں۔

جواب: عالمی سطح پر ابھی اردو کا کیا مقام ہے اس کا مجھے زیادہ علم نہیں۔ البتہ چند سال قبل کیے گئے سروے کے مطابق یہ دنیا کی چند اہم زبانوں میں سے ایک تھی۔ اس زبان کا المیہ یہ ہے کہ یہ جہاں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی وہیں اب سمٹتی جا رہی ہے۔ جبکہ دوسرے ممالک میں اس کا چلن بڑھ رہا ہے لیکن صرف بولنے کی حد تک۔ اس کا رسم الخط فروغ نہیں پا رہا ہے اور نئی نسل رومن اردو لکھ رہی ہے۔

سوال: سیاسی وجوہات کی وجہ سے ہم پاکستانی بنگال میں اردو کی صورتِ حال سے ناواقف ہیں؛ آپ اس سلسلے میں کچھ مدد کچھ کر سکتے ہیں؟

جواب: بنگلہ دیش میں اردو لگ بھگ ختم ہو چکی ہے۔ دو چار شاعر اور افسانہ نگار ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے چند ایک تو اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور باقی جو ہیں خاموش ہیں۔ البتہ سال گزشتہ وہاں اردو کا کوئی سیمینار ہوا تھا جس میں پٹنہ، بھارت سے صفدر امام قادری نے شرکت کی تھی۔ وہ سیمینار کس نوعیت کا تھا مجھے اس کا زیادہ علم نہیں۔

سوال: کیا انڈیا میں اردو ہندی تنازع پایا جاتا ہے؟ جب کہ پاکستان میں بعض پنجابی ادیبوں کا رویہ اردو کے حوالے سے متعصّبانہ ہے۔

جواب: انڈیا میں اردو ہندی کا تنازع بہت پرانا ہے۔ لیکن یہ تنازع زبان کا نہیں بلکہ رسم الخط کا ہے۔ ہندی میں اسی فی صد الفاظ اردو کے استعمال ہوتے ہیں لیکن دیوناگری میں، اور وہ اسے ہندی کہتے ہیں۔ آزادی سے قبل ہندو مسلمان اور سکھ سب کے سب فارسی رسم الخط استعمال کرتے تھے لیکن آزادی کے بعد ہندوستان میں ہندو تنظیموں نے ناگری پرچار سبھا کی بنیاد ڈالی اور فارسی رسم الخط کو ہٹا کر اس کی جگہ دیوناگری کو فروغ دیا اور آج عالم یہ ہے کہ جن گھرانوں میں اردو بولی پڑھی اور لکھی جاتی تھی وہاں کی نئی نسل اس زبان سے نا آشنا ہوتی جارہی ہے۔ ادھر چند برسوں سے اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں سے اردو کو بے دخل کیا جارہا ہے اور ایسا ماحول بنا دیا گیا ہے کہ اردو گھرانوں کے بچے بھی ہندی پڑھنے پر مجبور ہیں۔

سوال: کیا اس صورتِ حال سے اردو دان طبقہ خصوصاً لکھاری پریشان نہیں؛ اس کا کوئی حل؟

جواب: پریشان بھی ہیں اور دلبرداشتہ بھی لیکن کیا کیا جائے۔ اردو قلم کار کی سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ اس کا قاری گم ہو گیا ہے۔ پہلے یہاں بعض رسالے مثلاً شمع اور بیسویں صدی وغیرہ کثیر تعداد میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان رسالوں میں چھپنے والوں کی شناخت عوام اور خواص دونوں میں ہوتی تھی۔ بعض رسائل اپنے قلمی معاونین کو معاوضہ بھی دیا کرتے تھے لیکن "80" کے بعد ملک کا ماحول بدلنے لگا۔ اردو کے اہم رسالے یکے بعد

دیگرے بند ہونے لگے اور جو نئے رسالے جاری ہوئے ان کی ریڈرشپ بہت محدود رہی۔ اب کوئی بھی رسالہ زیادہ دنوں تک نہیں چلتا.

سوال: اس حوالے سے انجمن ترقی اردو ہند کا کیا کردار ہے یا وہ کیا کردار ادا کرسکتی ہے؟

جواب؛ انجمن ترقی اردو اب عضو معطل بن کر رہ گئی ہے۔

سوال: اس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو صرف پاکستان تک محدود ہو کر رہ گئی ہے؟ اور یہاں بھی اس کو دوسرے درجے کی زبان سمجھا جاتا ہے۔ اس زبان کا مستقبل؟

جواب: اردو کے مستقل کے سلسلے میں دو مدرسہ ءفکر ہیں۔ ایک یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ اردو ہندوستان اور پاکستان سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل رہی ہے، اس لیے اس کا مستقبل تابناک ہے، جب کہ دوسرا یہ سمجھتا ہے کہ اردو بولی کی حیثیت سے تو زندہ رہے گی لیکن اس کا رسم الخط دھیرے دھیرے ختم ہوتا جائے گا کیونکہ نئی نسل رومن اردو کا استعمال کر رہی ہے۔

سوال: انڈیا میں پنجابی کی کیا صورت حال ہے؟ کیا وہ بھی صرف سکھوں تک محدود ہے؟

جواب: انڈیا میں پنجابی صرف پنجاب کے رہنے والے ہی بولتے اور سمجھتے ہیں۔

سوال: "ریختہ" لائبریری فورم یا سائیٹ کی آج کل بہت دھوم ہے لیکن میں نے اس کے پلیٹ فارم پر چوتھے پانچویں درجے کے نام نہاد ادیب بھی دیکھے ہیں۔ یہ سرکاری پلیٹ فارم ہے؟

جواب: سنجیو سراف نام کے ایک اردو دوست نے " ریختہ" کی داغ بیل ڈالی ہے. اس کی اپنی ای لائبیر یری ہے جس میں اردو کی بے شمار کتابیں موجود ہیں اور یہ اردو کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس کے تحت ہر سال جشن ریختہ کا بھی اہتمام ہوتا ہوتا ہے جس میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے ادیبوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔

سوال: ہمارے ٹی وی چینل انڈیا کے مسلمانوں کی بے بسی اور بے کسی کی خبریں چلاتے رہتے

ہیں۔ ابرار مجیب کی سوشل میڈیا پر پوسٹیں بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہیں؛ کیا یہ سب سچ ہے؟
جواب: ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اب اتنی بری بھی نہیں جتنی کہ پاکستانی چینلز دکھاتے ہیں۔ یہاں تو مسلمان کے ساتھ ساتھ ہندو دلت بھی بعض مقامات پر بے بس اور مجبور ہے۔ لیکن حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔

سوال: گیان چند جین کی کتاب ؛ایک بھاشا، دو لکھاوٹ دو ادب؛ کے بارے میں ہندو ادبی کمیونٹی کی کیا رائے ہے۔

جواب: یہ تو مجھے نہیں معلوم۔

سوال: چین سے پاکستان کے دوستانہ تعلقات ہیں۔ ایران، سعودی عرب والے ہمارے مسلمان بھائی ہیں لیکن ان کی زبان سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے ایک عام پاکستانی بات چیت سے قاصر ہے؛ لیکن انڈیا اور پاکستان کے لوگ کسی بھی پلیٹ فارم پر جب چاہیں آپس میں گفتگو کر سکتے ہیں کیوں کہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہیں؛ اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے دوریاں مٹائی جا سکتیں ہیں؟

جواب: میں نہیں سمجھتا کہ لسانی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے ہندو پاک میں کوئی دوری ہے۔ درمیان میں صرف ایک سرحد ہے اور باقی جو ہے جو دونوں جانب کے سیاست دانوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی ہے۔

سوال: لیکن یہ دونوں اطراف سے فلموں ڈراموں (کہیں کہیں ناولوں، افسانوں) میں ایک دوسرے پر فوجی حملے دکھائے جاتے ہیں، پرچم جلائے جاتے ہیں؛ اس سے نفرت کو ہوا نہیں ملتی؟ اس کا تدارک کس طرح ہوگا؟ اہل قلم کی کیا ذمہ داری ہے؟

جواب: جی ہاں بالکل. اس طرح کی باتوں سے نفرت کو ہوا ملتی ہے۔ لیکن فلموں، ڈراموں اور ناول افسانوں سے زیادہ نیوز چینل نفرت کی آگ کو ہوا دیتے ہیں۔ اور یہ چیز سب سے

زیادہ خطرناک ہے۔مرض حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔اس کا علاج دونوں طرف کے عوام مل جل کر کر سکتے ہیں لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں لگتا۔ادیبوں کی ذمہ داری ہے کہ اس ماحول میں دوستی،امن وآشتی کے افسانے لکھیں،محبت کے گیت گائیں۔

سوال: پاکستان میں اردو اور دیگر مقامی زبانوں کو انگریزی سے خطرہ ہے، کیونکہ دفتری زبان ہونے کی وجہ سے انگریزی کو ان پر سبقت حاصل ہے۔انڈیا میں ہندی اور دیگر مقامی زبانوں کو بھی اسی صورت حال کا سامنا ہے؟

جواب: جی ہاں یہاں بھی زیادہ تر کام انگریزی میں ہوتے ہیں لیکن انڈیا میں اس سے ہندی کو بہت زیادہ خطرہ نہیں ہے کیونکہ ہندی والے اپنی زبان کے تیئں بیدار ہیں اور وہ انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی کے فروغ کی بھی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

سوال: کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ "ثالث" دوستی نمبر شایع کرے جس میں صرف برصغیر کے لوگوں کے وہ افسانے شامل ہوں جو دوستی اور باہمی محبت کے موضوع پر لکھے ہوں؟

جواب: اچھا مشورہ ہے۔ ویسے میرے رسالے میں زیادہ تر پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شایع ہوتی ہیں۔

سوال: پاکستان میں اب اہل قلم حکومت وقت سے خائف نہیں۔اور نہ کبھی کسی حکومت نے کسی صحافی یا ادیب کو خلاف لکھنے پر کوڑے مارے ہوں،البتہ مذھبی انتہا پسندی عروج پر ہے،کسی کے خلاف لکھا جائے تو گولی مار دیتے ہیں، چاہے سچ ہی کیوں نہ ہو،اس لیے ادیب اور صحافی انتہا پسندوں کے خلاف کچھ نہیں لکھتے؛ آپ کے ہاں کیا صورت حال ہے؟

جواب: یہاں بھی مذہبی انتہا پسندی عروج پر ہے اور حقیقت کو ظاہر کرنے والے ادیبوں اور صحافیوں کو گولیوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔

سوال: پاکستان میں نگران حکومتوں میں کبھی کسی ادیب کو وزارت نہیں دی گئی۔ ہمیشہ ججز

،اور بیوروکریٹ بازی لے جاتے ہیں۔کیا انڈیا میں بھی ایسا ہی ہے۔اگر ہے تو کیا ادیب میں یہ انتظامی ذمہ داریوں کی صلاحیت نہیں ہوتی ؟

جہاں تک مجھے علم ہے ہندوستان میں بھی کبھی کسی ادیب اور شاعر کو وزارت نہیں ملی.البتہ فلمی ہستیوں اور صحافیوں کو اس اعزاز سے نوازا جاتا رہا ہے۔جب کسی ادیب کو یہ ذمہ داری دی ہی نہیں گئی تو کیسے پتا چلے کہ ان میں انتظامی صلاحیت ہے یا نہیں۔

سوال:ادیب شاعر وغیرہ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتے؟

جواب: کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کا طریقہء کار مہذب ہوتا ہے لہذا سرکار کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔اپنی بات اگر وہ متشدد انداز میں کریں تو شاید کچھ اثر ہو۔

سوال: آج بھی درجنوں ڈائجسٹ فروخت ہو رہے ہیں اور ان میں لکھی جانے والی کہانیاں عوام میں مقبول بھی ہیں۔ادبی رسائل کیوں فروخت نہیں ہوتے؟میں نے مختلف خریداروں سے جب اس حوالے سے بات کی؛ان کا کہنا تھا کہ ادبی رسائل کی زبان بہت مشکل ہوتی ہے۔آپ ایک رسالے کے مدیر ہیں۔آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟

جواب:ایسی بات نہیں ہے کہ ادبی رسائل کی زبان مشکل ہوتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر ادبی رسائل وہ لوگ نکالتے ہیں جنہیں بزنس کی زیادہ سمجھ نہیں ہوتی ؛جب کہ ڈائجسٹ خالص تجارتی نقطہء نظر سے نکالے جاتے ہیں اس لیے انہیں اشتہارات بھی ملتے ہیں اور وہ فروخت بھی ہوتے ہیں۔

سوال : عام لوگوں کا خیال ہے کہ رسالے کا اجرا اور اشاعت شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: کسی بھی کام کو کرنے کے لیے مختلف لوگوں کے الگ الگ مقاصد ہوتے ہیں۔رسالہ نکالنا کسی کے لیے شہرت حاصل کرنے کا طریقہ ہے تو کوئی اسے صاحب اقتدار تک پہنچنے کا

زینہ بناتا ہے۔ کسی کو انعامات و اعزازات کی فکر ہوتی ہے؛ البتہ مجھ جیسے لوگ صرف اپنے ذوق کی تسکین کے لیے رسالہ نکالے ہیں۔

سوال: پاکستان میں اردو کی ترقی کے لیے جو ادارے بنائے گئے ہیں، ان میں میرٹ کی بجائے سفارش اور پارٹی بازی کا سکہ چلتا ہے۔ اردو کی بہتری کے لیے وہاں (انڈیا) کے اداروں کے عہدہ دار کس طرح منتخب ہوتے ہیں؟ کوئی میرٹ ہے؟ اردو زبان کی ترقی میں ان کا کوئی کردار ہوتا ہے؟

یہاں اداروں میں انھی لوگوں کو عہدہ دار بنایا جاتا ہے جنہیں لابی بنانے کا طریقہ آتا ہے اور جو صاحب اقتدار کو کورنش بجالانے کو فن سمجھتے ہیں۔

سوال: ممنون ہو جناب! آپ نے بہت وقت دیا۔

جواب: سلامت رہیں۔

ایڈووکیٹ اے رحمان دہلی

گوپی چند نارنگ کی فردِ جرم

نارنگ کے جرائم کی فہرست ویسے تو کافی طویل ہے لیکن ان کی سنگینی کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ جامعہ ملیّہ اسلامیہ کے دورِ ملازمت میں یونیورسٹی کے نام سے ملّیہ اور اسلامیہ الفاظ ہٹانے کے لئے باقائدہ سازش کی جس کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ لیکن سب سے زیادی نقصان جو اردو دنیا کو ہوا وہ ساہتیہ اکاڈمی پر نارنگ کے غاصبانہ قبضے سے ہوا۔ عرصہ تقریباً پچیس سال سے نارنگ نے ساہتیہ اکیڈمی کو اپنی جاگیر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے وہاں کے سرکاری ذرایع، وسائل اور سٹاف کا جس طرح استحصال کیا ہے اس کی تفصیلات ناقابلِ یقین ہیں۔ پچھلے پندرہ سال سے نارنگ نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القران چھپنے نہیں دی جبکہ اس سلسلے میں ایک مرتبہ وزیرِاعظم کے دفتر سے ہدایات بھی جاری کردی گئی تھیں۔ بلکہ اس سلسلے میں جب اس کی طباعت کا فیصلہ کیا گیا تو نارنگ نے اس کا دیباچہ لکھ کر چھپوانا چاہا۔ صرف اپنی تشہیر کے واسطے۔ کچھ لوگوں تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے بڑے سنگین طریقے سے احتجاج کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نارنگ کا دیباچہ تو روک دیا گیا لیکن ترجمان القران کی طباعت واشاعت بھی ٹھنڈے بستے میں چلی گئی۔ نارنگ کا سارا کاغذی و کتابی کام ٹائپ وغیرہ موسیٰ رضا نام کا ٹائپسٹ کرتا رہا ہے (اب بھی وہی کرتا ہے) یعنی دفتر کے کمپیوٹر پر، سرکاری اوقات میں۔ نارنگ کے کہنے پر اس نے Galaxy Printers نام سے ایک کمپنی کھول لی جو ساہتیہ اکیڈمی یعنی نارنگ کا سارا کام کرتی تھی۔ (دفتر کے کمپیوٹر پر، دفتر کے اوقات میں) اور اس کے بل ساہتیہ اکیڈمی ادا کرتی تھی۔ اکیڈمی کی ایک خاتون کلرک (جواب کہیں اور ملازم ہے) کی ہینڈ رائٹنگ میں بنے ہوئے بل

میرے پاس موجود ہیں۔ کمپنی کا راز کھل جانے پر کمپنی کی ملکیت موسیٰ رضا کے ایک دوست کے نام منتقل کر دی گئی۔لیکن نارنگ کا کام اور اردو کا دیگر کام اب بھی وہی کمپنی کرتی ہے۔ نارنگ کی کتاب ''غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'' ساہتیہ اکیڈمی سے شائع ہوئی۔ضابطے کی کارروائی کی پابندی کیے بغیر، اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔لیکن کوئی نہیں بتاتا کہ کتاب کتنی بکی کہاں بکی۔حیرت کی بات یہ ہے کہ کروڑوں کی جائداد اور اثاثوں کا مالک ہونے کے باوجود نارنگ نے نہایت گھٹیا اور دو دو پیسے کی چوریاں اور بے ایمانیاں کی ہیں۔ساہتیہ اکیڈمی ادبی کتابوں پر تبصرے کے لئے اچھا خاصہ معاوضہ ادا کرتی ہے لیکن ضابطے کے مطابق ایک سال میں ایک شخص ایک کتاب پر ہی تبصرہ کر سکتا ہے۔ نارنگ نے ایک آٹھ سالہ دورانیے میں پچاس کتابوں پر تبصرے کر کے پیسہ وصول کیا ہوا ہے اور تعجب یہ ہے کہ ان تبصروں کی رپورٹ بھی فائل پر نہیں ہے۔یعنی یہ پتہ نہیں کہ وہ تبصرے کب کیے گئے اور کہاں شائع ہوئے۔اس کے علاوہ غبن کے اور کئی معاملات ہیں جن کے سلسلے میں میں نے حقِ اطلاعات قانون کے تحت کئی درخواستیں داخل کی ہوئی ہیں لیکن ساہتیہ اکیڈمی نے آج تک ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ یہ معاملہ بھی اب سیدھا ہائی کورٹ جائے گا۔ترجمان القران کے معاملے میں تو کچھ لوگوں نے ساہتیہ اکیڈمی کے سامنے دھرنا دینے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ میں ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات کا انگریزی ترجمہ بھی کر رہا ہوں تا کہ اسے اصل مآخذ کتابوں کے ساتھ عدالت کے سامنے سرقے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے۔بہر حال میرا کتابچہ مفصّل طور پر نارنگ کے کرتوتوں کی داستان سنائے گا۔

ڈاکٹر نذر عابد

معاصر اُردو تحقیق: رجحانات و امکانات

تحقیق نا معلوم کو دریافت کرنے اور معلوم کو بازیافت کے عمل سے گزارنے کا نام تو ہے، تا ہم اس دریافت اور بازیافت میں جب تک حقائق کے تازہ زاویوں اور نئے گوشوں کو منوّر نہ کیا جائے، محقّق کی تحقیقی کاوشیں علمی دنیا میں اپنا اعتبار اور وقار برقرار رکھنے میں کامیاب و کامران نہیں ٹھہرتیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر تحقیق کے صبر آزما اور کٹھن مراحل سے گزرتے ہوئے محقّق کی ذات کا تحقیقی لگن، جگرسوزی، وسیع تر مطالعے اور عمیق تر مشاہدے جیسی موضوعی اور معروضی صفات سے متّصف ہونا لازم ہے۔

معاصر اُردو تحقیق پر ایک ناقدانہ نگاہ دوڑئی جائے تو سندی تحقیق اور غیر سندی تحقیق کی تقسیم کے پیشِ نظر سندی تحقیق کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے۔ اُردو میں غیر سندی تحقیق کے جو اعلیٰ معیاری نمونے حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، مالک رام، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں اور مشفق خواجہ جیسے اکابر محققین اور تدوین کار چھوڑ گئے ہیں، معاصر تحقیق میں اُس معیار کی تلاش و جستجو کارِ عبث ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے اُردو کے کسی بڑے متن کی حقیقی معنوں میں معیاری تدوین عمل میں نہیں آسکی۔ اقبالیات کو تحقیق کا ایک مستقل میدان بنانے کی کاوش نظر آتی ہے لیکن اس سلسلے میں بھی چند بندھے ٹکے اصولوں کے تحت توضیحی اور تشریحی نوعیت کی تحقیقی کاوشیں مستقل بنیادوں پر منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ اقبال جیسے نابغۂ روزگار صاحب فکر کے فکری رویّوں کی تفہیم کے لیے جس ذہنی بالیدگی کی ضرورت ہے، وہ اگر میسّر آ بھی جائے تو ان روشن خیال رویّوں کو منظر عام پر لانے کے لیے جس جرأتِ رندانہ اور ضربتِ قلندرانہ کی ضرورت ہے اُس کے لیے ہماری موجود

سماجی ومعاشرتی فضا روز بروز ناموزوں ہوتی چلی جارہی ہے۔اس کے علاوہ اقبالیاتی تحقیق کے حوالے سے ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے۔اب تک اقبالیات کے تناظر میں پیش کیے گئے تحقیقاتی مواد پر بھی مختلف تحقیقی زاویوں سے روشنی ڈالنے کی اشد ضرورت ہے تا کہ تقلیدی رویّوں سے آزاد ہوکر اقبالیات کے حوالے سے مختلف حقائق کو از سرنو جانچنے پرکھنے کی روش ڈالی جاسکے۔

لسانیات جیسے خالص تحقیقی موضوع پر بھی نظری اور عملی ہر دو حوالوں سے چند ابتدائی نوعیت کی تحقیقی کاوشوں کے سوا ہمارے ہاں کوئی بڑا تحقیقی منصوبہ سامنے نہ آسکا۔حافظ محمود شیرانی، نصیر الدین ہاشمی ،شوکت سبزواری، سید سلیمان ندوی، ،محی الدین قادری زور، پنڈت کیفی اور عین الحق فرید کوٹی جیسے ماہرین نے علاقائی تناظر میں اُردو کی بنیادوں اور لسانی رویّوں کا کھوج لگانے کی قابل قدر کاوشیں کیں۔بعد میں اس حوالے سے جو بھی لکھا گیا ،انہی ماہرین کی اخذ کردہ معلومات ہی کی بڑی حد تک جگالی کی گئی۔لسانیات کو ایک اور زاویے سے دیکھا جائے تو یہ جدید اسلوبیات کے تحت کسی فن پارے کی جانچ پرکھ کرتے ہوئے ایک اہم حوالہ بنتا ہے۔یوں اسلوبیات کے جدید اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی فن پارے کی معنیاتی اور نحویاتی پرتوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے لکھنے والے کے مختلف لسانی رویّوں کو سامنے لایا جاسکتا ہے۔اُردو میں اس سطح کے تحقیقی وتنقیدی مطالعات کی بھی اشد ضرورت ہے۔

اُردو کے شعری ونثری فن پاروں میں بین العلومی سطح کے تحقیقی مطالعے کی از حد ضرورت اور گنجائش موجود ہے۔علم نفسیات، بشریات، معاشیات اور دیگر فطری وسماجی علوم کے مختلف نظریات کے اطلاقی نوعیت کے تحقیقی وتجزیاتی مطالعات نہ صرف کسی بھی فن پارے کی تفہیم وتسہیل کے نئے دریچے وا کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں بلکہ ایسے مطالعات علمی و

ادبی بنیادوں کی وسعت کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔

اُردو تحقیق وتنقید میں ایسی چند مثالیں مل سکتی ہیں لیکن اس سلسلے کو کامل علمی سنجیدگی سے مزید آگے بڑھانے کی طرف توجہ دینا یقیناً جدید معاصر تحقیق کے تقاضوں کو احسن انداز میں نبھانے کے مترادف ہے۔

جہاں تک سندی تحقیق کا تعلق ہے تو جیسا کہ شروع میں کہا گیا کہ معاصر اُردو تحقیق میں اس سطح کی تحقیق کا پلڑا بھاری ہے۔ جامعات میں بی۔ایس کی سطح سے لے کر پی۔ایچ۔ڈی کی سطح تک سندی تحقیق کے تحت تسلسل کے ساتھ تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں اور نتیجے کے طور پر سندیں وصول کی جا رہی ہیں۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن اور جامعات کی طرف سے دی گئی مختلف مراعات کی بدولت اس قسم کی تحقیق روز افزوں ترقی کرتی چلی جا رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ترقی کی یہ رفتار تحقیق کے گرتے معیار پر سمجھوتے کی مرہونِ منت ہے۔ جب مقصد محض ڈگری کا حصول ہو یا تحقیق جیسے جنوں پیشہ کام سے چند مالی مفادات وابستہ کر لیے جائیں تو ایسے حالات میں بلند پایہ تحقیقی نمونوں کی اُمید رکھنا محض خام خیالی ہے۔

سندی تحقیق میں بہ استثنائے چند عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ چند گھسے پٹے موضوعات کے حوالے سے فارمولا خاکے تیار کر لیے جاتے ہیں۔ لگ بھگ ایک ہی طرح کی ملتی جلتی ابواب بندی کر لی جاتی ہے اور پھر اِدھر اُدھر سے کچھ ملتے جلتے مواد کو ایک نسبتاً نئی ترتیب کے ساتھ کمپوز کر کے مقالہ جوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر چہ کچھ جامعات میں اِن مقالہ جات کو سرقہ بازی کی ایک آزمائش سے بھی گزارا جاتا ہے لیکن وہ ایک ایسا سوفٹ وئیر ہے جو سرقے کی اصلیت کی نشان دہی کرنے سے قاصر ہے۔ ٹرنی ٹین نامی یہ سوفٹ وئیر محض انٹرنیٹ پر موجود مواد سے زیرِ آزمائش مواد کی میچنگ کر سکتا ہے۔ سو جملے میں ایک آدھ لفظ اِدھر اُدھر کر دیا جائے تو اس آزمائش سے گزرنے والا تحریری مواد جدید ٹیکنالوجی کی آنکھوں میں

ڈھول جھونکتا ہوا سرقہ بازی کے حوالے سے سرخرو ٹھہرتا ہے۔

یوں ہائیر ایجوکیشن کمیشن کی نظر میں تحقیق فروغ پاتی ہے، مقالہ نگار جامعہ کے شعبۂ امتحانات سے ڈگری پاتا ہے اور نگرانِ کار جامعہ کے خزانے سے مالی تمسّکات اور وقتاً فوقتاً گریڈ کا ترفّع پاتے ہیں۔ خالص سطح پر محض پڑھنے لکھنے سے تعلق رکھنے والے چند سر پھرے غالب کا شعر دوہراتے ہوئے سر پیٹتے رہ جاتے ہیں:

خامہ انگشت بدنداں ہے اِسے کیا لکھیے

ناطقہ سربہ گریباں ہے اِسے کیا کہیے

ڈاکٹر محمد شعیب خان

انور مسعود اور نظیر اکبر آبادی

(شخصیت و فن پر ایک نظر)

انور مسعود اور نظیر اکبر آبادی اردو زبان کے معروف عوامی شاعر ہیں۔ ان دونوں کی صرف شاعری ہی میں اشتراک نہیں بلکہ ان کی شخصیت میں بھی حیرت انگیز حد تک مماثلت پائی جاتی ہے، البتہ کہیں کہیں ایسے تضادات سامنے آتے ہیں، جہاں دونوں ایک دوسرے سے بہت دور کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ذیل میں دونوں کی شخصیت کا مختلف حوالوں مختصر مطالعہ پیش ہے:

i۔ **وضع قطع:**

انور مسعود درمیانے قد کے مالک ہیں۔ رنگ گندمی، متناسب چہرہ، آنکھوں میں نمایاں چمک اور چوڑی پیشانی جو پہلی ہی نظر میں ان کی ذہانت پر دلالت کرتی ہیں۔ ڈاڑھی صاف اور پست موچھیں، جب کہ ناک درمیانہ، بہت بلند نہ بہت چھوٹی۔ عہد شباب میں جسم بھرا بھرا تھا، بڑھاپے میں جوانی والی صورت نہیں رہی، چال سے متانت اور وقار جھلکتا ہے ، ذوقِ خوش لباسی جوانی سے اب تک قایم ہے۔

اب نظیر کی وضع قطع کا مطالعہ کرتے ہیں: ''کلیاتِ نظیر'' میں نظیر اکبر آبادی کی جو تصویر کشی ملتی ہے، وہ کچھ یوں ہے:

''رنگ گندم گوں، قد متوسط، پیشانی بلند اور چوڑی، آنکھیں چمکدار، ناک بلند، داڑھی خشخشی، موچھیں بڑی، لباس وہی جو محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں دہلی کے اندر رائج تھا

یعنی کھڑکی دار پگڑی، گاڑھے کا انگرکھا سیدھا پردہ نئی چولی، اُس کے نیچے کُرتا، ایک برکا پاجامہ، گھتیلی جوتی، ہاتھ میں شام دار چھڑی، انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگھوٹھیاں۔‘‘[۱]

دونوں کی وضع قطع کے درج بالا مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی شکل و شباہت میں کافی حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔ایک اور مماثلت دیکھیے کہ دونوں اپنی اپنی صدی کے چوتھے عشرے میں متولد ہوئے۔نظیر کی پیدائش ۱۷۳۵ء اور انور مسعود کی ۱۹۳۵ء ہے۔دو صدیوں کے فرق کے باوجود دونوں کا سالِ پیدائش ایک ہی ہے۔ٹھیک دوسو سال بعد ایک ہی مزاج کا دوسرا شخص تخلیق کرنا قدرت کی صناعی کا حسین نمونہ ہے۔

ii۔ عوامی مزاج:

کئی شخصیات ایسی ہوتی ہیں، جو شکل وشباہت میں تو ایک دوسرے کے مماثل ہوتی ہیں، لیکن ان کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔لیکن نظیر اور انور کی شکل وشباہت میں موجود مماثلت ان کے مزاج میں بھی کافی حد تک موجود ہے۔عوام سے قربت ان کو میلوں ٹھیلوں میں یکجا کرتی ہے۔انور مسعود یہی پسِ منظر میں کبھی ’’اَج کیہ پکایئے‘‘ میں چودھری اور رحماں کا مکالمہ سنتے ہیں، تو کہیں ’’انارکلی دیاں شاناں‘‘ میں ایک بھینس سے مخاطب ہو کر بڑے بازاروں کی رونقوں کو سننے والوں کی نگاہوں میں بسا دیتے ہیں۔یہ وہی بازار ہیں، جہاں امیر کبیر لوگ خریداری کرتے ہیں اور مفلس اپنی جھولیاں خالی کی خالی واپس لے جاتے ہیں۔ کہیں جہلم کے پُل کے اُوپر کھڑی لاریوں میں گھوم پھر کر اشیا فروخت کرنے والوں کی وارداتوں کا مفصل احوال بیان کر کے عوامی زندگی کو بیان کرتے ہیں، تو کہیں شہروں میں پھیلے گرد وغبار، شور شرابے، درختوں کی پامالی وغیرہ کو ’’میلی میلی دھوپ‘‘ میں مقید کر دیتے ہیں۔یہی خاصیتیں انور مسعود کے عوامی مزاج کا پتا دیتی ہیں۔

جب نگاہ نظیر اکبر آبادی کے مشاغل کی جانب اُٹھتی ہے تو وہ نہ صرف لوگوں کی مصروفیات کا جائزہ لیتے ہیں ، بلکہ خود بھی ان میں شریک ہو کر پورا پورا لُطف اٹھاتے ہیں۔ہولی، دیوالی، دسہرہ، بسنت، عید، محرم ، شب برات، عرس، میلے وغیرہ پر نظیر کی نظمیں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ ان تہواروں کے چھوٹے سے چھوٹے جز کو نظر انداز نہیں کرتے اور معلومات کے سمندر میں زبان دانی کے کرشمے ملا کر واقعے کو مجسم کر دیتے ہیں۔ان کے موضوعات وہی ہیں ، جو اُن کے ارد گرد بسنے والے لوگوں کی روزمرہ سرگرمیوں میں موجود تھے۔ اسی وجہ سے راہ چلتے اشعار اور نظمیں کہہ ڈالتے ، جو زیادہ تر فرمائشی ہوتی تھیں اور انھیں کی بدولت نظیر کی شہرت دور دور تک جا پہنچی تھی۔

iii۔ **قناعت پسندی** (حسد، لالچ، کینہ، ہوس، ریا، رنج وغیرہ سے دور رہنے کا سبب)

انور مسعود کے کردار کی ایک نمایاں خوبی اِن کی قناعت پسندی ہے(گو کہ اب اُن کے ہاں دولت کی ریل پیل ہے)۔ عالمی شہرت کے باوجود فقیرانہ اور عوامی مزاج ان کو ریا کاری، ہوس، لالچ وغیرہ سے کوسوں دور کھڑا کیے ہوئے ہے۔اب تک اُسی مکان میں رہائش پذیر ہیں، جو پہلی مرتبہ زمین خرید کر تعمیر کرایا تھا۔مزاح گوئی میں یکتائی کے باوجود ہر مشاعرے میں ''بلا حیل وحجت'' چلے جانا ان کے کردار کو جان دار بنا دیتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی میں حد درجہ قناعت پائی جاتی تھی ۔ جہاں بیٹھ گئے وہیں ڈیرہ جما لیا۔کھانے کی فکر نہ روپے کا لالچ ۔نظیر کی قناعت پسندی پر عبدالمومن الفاروقی لکھتے ہیں:

''۔۔۔نظیر مفلس تھا مگر بڑا قانع تھا۔اس کی قناعت اس کی زندگی کا ایک مستقل اور نہایت دلچسپ باب ہے۔اس کی قناعت کا درجہ اس لیے بہت بلند ہے کہ اس کی قناعت مجبوری کا دوسرا نام نہیں بلکہ ان تمام پاکیزہ اجزا سے مرکب ہے جو اس صفت کا لازمہ ہیں ۔۔۔۔دنیا کے بہت سے اربابِ کمال زندگی بھر مفلس رہے ہیں مگر خود اختیاری مفلسی کا

شرف بہت کم کو حاصل ہوا ہے۔ جو نفس، نظیر کی طرح جہاد کرے گا وہی قناعت کے اتنے بلند مرتبے پر فائز ہوسکتا ہے۔'' [۲]

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دونوں شاعر قناعت پسندی کی دولت سے مالا مال رہے۔ مصنوعی شاہانہ زندگی سے لاتعلقی، عوام کے شانہ بشانہ وقت گزارنا اور حسد و کینہ کا خیال تک دل میں نہ لانا ان کو ہر طبقہ میں باعثِ تکریم بنا دیتے ہیں۔ یہاں صرف ایک تضاد ہے کہ انور مسعود نے مفلسی کی چادر کو عشروں پہلے اُتار پھینکا اور اب ''اللہ اُن سے راضی ہے!''

iv۔ مذہب و اخلاقیات:

انور مسعود کا تعلق مذہبی گھرانے سے ہے۔ ان کے والد درویش صفت آدمی تھے اور گھر میں نماز، روزہ وغیرہ کی پابندی تھی۔ انور مسعود بھی پانچ وقت کے نمازی ہیں۔ بڑھاپے میں جب اعضا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں تو سستی غالب آ جاتی ہے، لیکن انور مسعود ہر صورت نماز ادا کرتے ہیں۔ حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ محبت و اخلاص سے پیش آتے اور چھوٹوں پر خصوصی شفقت فرماتے ہیں۔ میرا اُن کے ساتھ جتنی مرتبہ ملنا ہوا، بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ باتیں کر رہے ہوں تو گھنٹوں اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان کی اردو اور پنجابی شاعری بھی مذہب و اخلاقیات کے مضامین سے مزین ہے۔

نظیر اکبرآبادی مذہبی رسومات کے پابند تھے اور اس کے لیے بہت سا روپیہ صرف کرتے۔ محرم کی مجالس میں خصوصی طور پر شرکت کرتے تھے۔ تذکروں سے نماز کی ادائیگی کا علم بھی ہوتا ہے۔ اخلاقیات کے متعلق عبدالمومن فاروقی کی رائے ہی سے استفادہ کرنا پڑے گا:

''میاں نظیر میں حلم بہت آ گیا تھا۔ خلیق و متواضع بے حد تھے جس مجلس میں بیٹھتے

اخلاق کے نور سے شمعِ انجمن معلوم ہوتے۔ نادرہ سنج ایسے تھے کہ کوئی بات لطیفہ سے خالی نہ تھی جو بات ہوتی نظم میں مخمس ہوتی، احباب اور ہم صحبتوں کو اپنی لطافت سے شگفتہ کر دیتے جود و احسان میں بھی کبھی کمی نہ کی۔ میاں نظیر کے اخلاق کی ان کی زندگی میں دور دور شہرت ہو گئی تھی۔۔۔۔'' [۳]

۷۔ درس و تدریس:

انور مسعود نے حصولِ رزق کے لیے درس و تدریس کو وسیلہ بنایا۔ ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ گھریلو حالات نا گفتہ بہ ہونے پر لوگوں کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ تعلیم کے اختتام پر اسی پیشے سے مستقل طور پر وابستہ ہو گئے اور اپنی تمام زندگی اسی شعبے میں گزار دی۔ فارسی زبان اور شعر و ادب کے حوالے سے ان کی تدریسی خدمات کئی عشروں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ابتداً انگریزی بھی پڑھاتے رہے۔ چار زبانوں اردو، فارسی، انگریزی اور پنجابی میں مہارت کی بدولت ان کا محاورہ بے مثل ہے۔

میاں نظیر کا مشغلہ بھی معلمی تھا۔ اُس زمانے میں امرا اپنے بچوں کی تربیت کے لیے اساتذہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے پاس رکھتے تھے۔ اس طرح نظیر کو بڑے بڑے لوگوں کے بچوں کو پڑھانے کا موقع ملا۔ نظیر اپنے درس میں عام لوگوں کے بچوں کو بھی شریک کیا کرتے تھے۔ سیر و سیاحت کے شوق نے انھیں چلتے پھرتے مدرسے کی صورت دے رکھی تھی۔ کبھی ایک جگہ ٹھکانہ رکھ لیتے اور کبھی گلیوں گلیوں لوگوں میں گھل مل کر ان کے علم میں اضافہ کرتے۔ بقول عبدالمومن فاروقی:

''پرانی کمائی پاس تھی۔ مکتب داری کا شغل لے بیٹھے۔ کچھ روز کو متھرا گئے۔ پھر لوٹ آئے۔ یہاں قلعہ دار مرہٹہ ''بھاؤ'' تھا اُس نے بلایا اور آپ سے پڑھنا شروع کیا۔ یہاں سے چُھٹے تو نواب محمد علی خان امرائے آگرہ سے تھے، مکان مائی تھان میں تھا۔ اُن

کے یہاں لڑکوں کو پڑھانے جانے لگے۔یہیں سے لالہ بلاس رائے کھتری سے راہ ورسم ہو گئی۔ جب نواب کے یہاں سے جدا ہوئے تو رائے صاحب نے سر آنکھوں پر بٹھایا اور اپنے بچوں کو سپردگی میں دیا اور ان کی جملہ ضروریات کی کفالت اپنے ذمہ لی۔ لالہ کے چھ لڑکے من سکھ رائے، گوز بخش، ہر بخش، مولچند، بنسی دھر اور شنکر داس زیرِ تعلیم تھے۔'' [۴]

دونوں نامور شعرا کی شخصیت کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اُن کا خمیر ایک ہی مٹی سے اُٹھا تھا۔ دونوں کے مشاغل ایک، پیشہ مشترک، طبیعت میں شگفتگی اور عوامی مزاج نے انھیں لوگوں کے دلوں کے قریب کر کے عمرِ خضرؑ عطا کر دی ہے۔

شاعری کا تقابلی مطالعہ

i۔ جدّت طرازی:

انور مسعود زبان میں جدت واختراع کے حامی ہیں۔ان کے کلام اور بیان میں الفاظ موتیوں کی لڑی کی طرح پروئے ہوتے ہیں۔ ہر لفظ اور محاورہ اس طرح اپنی جگہ پر جما ہوتا ہے، جیسے اس کے لیے اِس سے زیادہ مناسب جگہ کوئی اور نہ ہو۔ضرب الامثال اور محاورات کو استعمال کرنے کے لیے ایک پورے اسٹیج کا اہتمام کرتے ہیں۔کلامِ انور سے اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ایویں میں قران دیاں قسماں نئیں چکدا
دلوں جے مکایئے نہ تے وہم نئیں جے مکدا

جنتری دا گاہک ایتھے کوئی وی نئیں دسدا
چوراں دا جو مُٹھا ہووے کسے تے نئیں وِسدا

نہ کوئی سیرت نہ کوئی صورت مونہہ کوئی نہ متھا
توں تے انجے جاپیں جیونکر جن پہاڑوں لتھا

دیس پرائے رانی خاں دی توں سالی بن بیٹھی
منگن آئی اگ تے آپوں گھر والی بن بیٹھی

نظیر کی جانب نظر ڈالیں تو اُن کے ہاں جدت واختراع کی کھیتی بڑی شاداب ہے۔ زبان پر دسترس کا اظہار اس خوبی سے کرتے ہیں کہ خیال مزید نکھر جاتا ہے۔اردو، فارسی اور ہندی زبانوں کے اختلاط سے نہیں چوکتے اور تینوں کے الفاظ کو یکجا کر کے معانی کے دریا بہاتے دیتے ہیں۔محاورات کے استعمال میں دلچسپی کی مثالیں تو بے شمار مل جاتی ہیں:

''نظیر میں جدت واختراع کا مادہ بھی بہت تھا،جس کی مثالیں اس کے کلام میں بہت مل سکتی ہیں۔اس زمانہ میں مسلسل غزلیں کہنے کا رواج تھا۔۔۔۔صرف ایک محاورے یاضرب المثل کے لیے پوری غزل کہہ ڈالنا نظیر ہی کی جدت تھی۔۔۔۔''[۵]

نئے نئے قافیے نظیر کی غزل کو بےنظیر بنادیتے ہیں۔مثلاً:

گلہ لکھوں میں اگر تیرے غم کے جُھلوں کا
تو ہو نباہ نہ پچھلوں کا اور نہ پہلوں کا
سنے سے نام محبت کا تھرتھراتے ہیں
یہ کچھ تو حال ہے تیرے ستم کے دہلوں کا
کہا جو یار سے اک دن گر دل یہ چاہے ہے
طریق جیسے ہے عشرت کے اہلے گہلوں کا

یہ سن کے اُس نے کہا یہ تو وہ مثل ہے نظیر
کہ سوویں جھونپڑے میں خواب دیکھیں محلوں کا

ii۔ عوامی موضوعات:

انور مسعود کے شعری موضوعات بسوں، لاریوں، دفاتر، سبزی و گوشت فروشوں کی دکانوں، میلوں ٹھیلوں، سکولوں کالجوں، گھریلو مسائل اور لوگوں کے رویوں سے جنم لیتے ہیں۔ نظم ''جہلم دے پُل تے'' عام مسافروں کے سفر کی روداد کے ایک حصے کو سامنے لاتی ہے۔ ''جمعہ بازار'' اور ''انارکلی دیاں شاناں'' بازار نما میلوں کا منظر بیان کرتی ہیں، تو ''پِٹ سیاپا'' میں ساس اور بہو کے روایتی جھگڑوں کا تذکرہ ہے۔ ان کی شاعری میں عوام کی دلچسپی اور مقبولیت کی ایک اہم وجہ عوامی موضوعات کی بہتات ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے نظیر کو ''عوام کا اکلوتا شاعر'' کہا ہے۔ اس کی نظمیں عوام کے ایک ایک دُکھ کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ ''کوڑی کی فلاسفی، روپے کی فلاسفی، زر کی فلاسفی، افلاس کا فوٹو، آٹے دال کی فلاسفی، روٹی کی فلاسفی، چپاتی کی فلاسفی، پیٹ کی فلاسفی، آدمی کی فلاسفی'' وغیرہ میں مشاہدات کے پیچھے تجربات کی تلخیاں صاف دکھائی دے جاتی ہیں، جن سے عام آدمی کی طرح نظیر بھی متاثر تھے۔ وہ بڑی بے باکی کے ساتھ سب تصاویر کی گٹھڑیاں کھول کر عوام کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''نظیر نے ایک عام آدمی کی طرح بھرپور زندگی گزاری۔ ہر کھیل تماشے اور بازی، تہوار۔۔۔ میں حصہ لیا۔ ہر وہ کام کیا جو اس معاشرے کا فرد کرتا تھا نظیر نے کیا اور طبقۂ خواص کی طرح چھپایا کچھ نہیں۔ اسی سے ان کی شاعری میں توانائی اور اثر و تاثیر پیدا ہوتے ہیں۔۔۔ وہ عوام کے آدمی تھے اور ساری عمر ان سے جڑے رہے اور ساتھ ہی اپنی زندگی کو کھلے انداز میں بیان کرتے رہے۔۔۔ اردو شاعری میں یہ عوامی پہلو اس تیور کے ساتھ پہلی

بار اُبھرا اور نمایاں ہوا ہے۔۔۔"[٦]

"مفلسی کی فلاسفی" کے چند بند دیکھیے، جن میں مفلس کی حالت کو ایک وسیع تناظر میں مثالوں کے ذریعے سلیس زبان میں باندھا گیا ہے:

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اُس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اُسے بے بتاتے ہیں
وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
اُن کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی
وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی
تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

iii۔ زبان دانی اور معلومات:

شاعری کے لیے زبان دانی اور معلومات بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ انور مسعود اپنی شاعری میں جس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اُس کی تمام تر تفصیلات کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ''جمعہ بازار'' جیسی نظم بیٹھے بٹھائے تخلیق نہیں ہو جاتی، اس کے لیے بازاروں کے سینکڑوں چکر لگا کر معلومات حاصل کرنا پڑتی ہیں۔ معلومات کے حصول کے بعد ان کو کاغذ پر اُتارنے کا عمل ڈھنگ، سلیقہ اور زبان دانی کا متقاضی ہوتا ہے۔ انور مسعود بڑی بڑی معاصر زبانوں پر دسترس کے باعث مضمون کو لفظوں کے سحر میں قید کر دیتے ہیں۔

''جمعہ بازار'' کے اختتام پر سارے دن کی مشقت سے تھکے ماندے سوداگر گھر جانے کی جلدی میں اپنا سامان اونے پونے بیچنے لگتے ہیں کیونکہ اُن کو اس وقت تک اپنا منافع وصول ہو چکا ہوتا ہے۔ بہت سے خریدار اس موقع کی تاک میں ہوتے ہیں اور سستے سامان پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ جب سب کچھ ختم ہو جاتا ہے تو کچھ لوگ سامان کی خالی پیٹیاں جلا کر آگ کے گرد بیٹھ کر حرارت کے مزے لیتے ہیں۔ اس اختتامی منظر کو انور مسعود نے جس طرح نظم کے آخری بند میں بند کیا ہے وہ اِن کی انشا پردازی اور معلومات کا منہ بولتا ثبوت ہے:

شامیں سستے وِیچن لگ پئے سودے وِیچن والے
ایہو موقع ویکھ رہے سن کئی خریدن والے
ایدوں بعد ملنگاں وانگوں بیٹھے بیٹھن والے
سودے والی خالی پیٹی بال کے سیکن والے
رات، ہنیرا، بھانبھڑ، تارے جمعہ بزارے ویکھے
کیسے کیسے عجب نظارے جمعہ بزارے ویکھے

یہ انداز صرف ایک نظم کا نہیں ہے، ان کی تمام نظمیں معلومات اور زبان دانی کے

سلیقے کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ یہ انداز عوامی زندگی کی جزئیات سے آگہی اور تجربے کی بھٹی سے گزرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

نظیر کی زندگی کے واقعات کا عکس اُن کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی رُجحانات سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی نظموں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ایک شخص مختلف مناظر دیکھتے ہوئے اُن پر رواں تبصرہ کر رہا ہے اور اُس کی نظر سے کوئی چیز چھپی نہیں ہے۔ کھیلوں کے رموز ہوں یا مذاہب کے ارکان، نظیر ان کے ایک ایک جز پر غیر معمولی رائے زنی کرتے ہیں جس سے اُن کی معلومات وزبان دانی کا قائل ہونا پڑتا ہے:

"۔۔۔ان (زبان اور معلومات) میں سوائے انشا کے کوئی دوسرا شاعر نظیر کا مقابل نہیں ٹھہرتا۔ نظیر جس چیز کا ذکر کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمام متعلقات اور ضروری چیزیں اس کے گرد وپیش کھڑی ہوئی ہیں اور وہ ان کو دیکھ دیکھ کر اشعار میں نظم کرتا جاتا ہے۔ ان میں اکثر چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو دوسرے لوگ جاننا تو کیسا پہچانتے بھی نہیں۔۔۔۔" [۷]

iv۔ ہمہ گیری:

انور مسعود کی شاعری معاشرے کے اُس بڑے طبقے کی سرگرمیوں، رُجحانات اور تہذیب وتمدن سے جنم لیتی ہے جو رعایا کہلاتا ہے۔ ان کی تکالیف، مسائل، غم اور خوشیاں انور مسعود کے مشاہدے میں آ کر کاغذ پر اس طرح نقش ہو جاتے ہیں جیسے کسی سفید کپڑے پر مختلف رنگوں کے نشان ہوں۔ ان کے اشعار میں آنے والے واقعات روزمرہ زندگی سے جنم لے کر عوامی زبان و لہجے سے ہم آہنگ ہونے کے بعد مانوسیت کا سبب بنتے ہیں۔ ان کے موضوعات ہمہ گیر ہیں اور ایک مزدور سے لے کر جدید سائنسی مباحث تک

کا احاطہ کرتے ہیں۔

نظیر کی شاعری کئی عشروں کے حالات وواقعات کی عکس بندی ہے۔ ہر وہ واقعہ اور منظر جو اُن کی نگاہ میں آتا ہے، ایک دم شعری روپ دھار لیتا ہے۔نظیر نے اپنی زندگی میں بہت سے مشاغل اختیار کیے اورانھیں امرا کی صحبتیں بھی میسر آئیں۔ان سب کا احوال ان کی شاعری میں ہمہ گیریت کا عنصر پیدا کرتا ہے۔''کلیات نظیر'' ہمہ گیریت کا ایک بیش قیمت خزانہ ہے جس میں ہر شخص کی پسند کا موضوع جزئیات کے ساتھ موجود ہے:

''۔۔۔اس (نظیر) کا کلیات ایک ایسا نایاب ذخیرہ ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو معیشت ومعاشرت کا کوئی انداز اوراحساسات وتاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو۔ امیروغریب، شاہ وگدا، زاہدورند،سنجیدہ وغیر سنجیدہ، ہندو مسلمان۔۔۔سب کی دلچسپی کا سامان اس میں موجود ہے اور عالمِ محسوسات کی شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس کا ذکر کسی نہ کسی نہج سے نظیر نے نہ کیا ہو۔مشاغلِ زندگی،ضروریاتِ انسانی مظاہرِ تمدن میں ''مقطع'' اور ''ہنسوڑ قسم کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے نظیر نے چھوڑ دیا ہو اور جس پر پورے اہتمامِ شاعرانہ کے ساتھ تمام ممکن صنائع وبدائع لیے ہوئے قلم نہ اُٹھایا ہو۔۔۔۔''[۸]

۷۔ شوخی وظرافت:

انور مسعود کو طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں خصوصی مقام حاصل ہے۔ان کی شاعری میں پائی جانے والی شوخی وظرافت نے انھیں عوام وخواص میں ہر دل عزیز بنا دیا ہے اور یہی شاعری ان کی پہچان بن چکی ہے۔خود انور مسعود کو اس بات کا اعتراف ہے کہ لوگ ان کے ہاں طنز ومزاح کو دیکھ کر اس کے پیچھے چھپے ہوئے درد والم کو بھول جاتے ہیں:

میں رہیا انور سدا زخماں تے پردے تاندا

لوک بھلیں پے گئے بُلھاں تے ہاسا ویکھ کے

شوخی وظرافت انور مسعود کے مزاج کا حصہ ہے۔اُن کی ہر بات مزاح کے پیرائے میں ہوتی ہے اور بڑے سے بڑے المیے کا اظہار اس سُرعت سے طنز ومزاح میں کر جاتے ہیں کہ اُس کا اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔بعض الفاظ کے اُلٹ پھیر کی مدد سے کرداروں اور واقعات کی ایسی ایسی مضحک تصاویر پیش کر جاتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والوں کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آجاتی ہے۔

نظیر کی ظرافت انور مسعود کے مقابلے میں پست ہے۔عریانی نے نظیر کی طبیعت میں پائی جانے والی شوخی وظرافت کو گہنا دیا ہے۔عبدالمومن فاروقی ،نظیر کی شگفتگی میں پائے جانے والے ابتذال وعریانی کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نظیر کی طبیعت میں ظرافت کا مادہ بہت نمایاں تھا۔اس ظرافت کا اثر اس کے فن میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔وہ ظریف وصاحبِ مزاح ہے لیکن مضحک اور ہنسوڑ نہیں، نظیر کے فن میں عریانی حد سے زیادہ واقعیت پسندی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔اس کا مقصد بھانڈ پن یا پھکڑ پن نہیں۔۔۔''[۹]

نظیر مزاحیہ واقعات کو شاعرانہ رنگ دینے میں باکمال تھے۔مولانا عبدالمومن فاروقی ''کلیاتِ نظیر'' کے مقدمہ میں اسی نوعت کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

''میاں نظیر دوپہر کا کھانا رائے صاحب ہی کے یہاں کھاتے ایک روز بیسنی روٹی بھی کھانے میں شامل تھی۔اچار کے لیے جی چاہا۔گھر میں بچا نہ تھا۔بھولا رام پنساری کا لڑکا بھی اُن کے پاس پڑھنے آبیٹھتا تھا۔اس سے کہا لالہ جا اپنے چاچا سے کہیو میاں نے آم کا اچار منگایا ہے۔وہ لپکا ہوا پُھلٹی آیا۔دکان پر گاہکوں کی بھیڑ لگی تھی۔لڑکے نے میاں نظیر کا نام لیا کہ اچار منگا رہے ہیں۔بھولا رام نے مٹکی میں سے چنگل بھر دونے میں رکھ لڑکے کو

حوالے کیا اور سودا دینے میں لگ گیا۔ یہ لیے استاد کے پاس پہونچا (پہنچا) منتظر بیٹھے تھے۔ دونہ کھول کر جو دیکھا تو چوہا مصالحہ میں لت پت تھا۔ انھوں نے اس کو رکھوا دیا۔ شام کو رائے صاحب آئے اُن سے کہا بھولا کو بھی بلوا لوا ایک لطیفہ ہے۔ وہ آیا تو ایک نو تصنیف مخمس پڑھا:

پھر گرم ہوا آن کے بازار چوہوں کا
ہم نے بھی کیا خوانچہ تیار چوہوں کا
سر پاؤں کچل کوٹ کے دو چار چوہوں کا
جلدی سے کچومر سا کیا مار چوہوں کا
کیا زور مزیدار ہے اچار چوہوں کا

اول تو چوہے چھانٹے ہوئے قد کے بڑے ہیں
اور سیر سوا سیر کے مینڈھک بھی پڑے ہیں
چکھ دیکھ مرے یار یہ اب کیسے کڑے ہیں
چالیس برس گزرے ہیں تب ایسے سڑے ہیں
کیا زور مزیدار ہے اچار چوہوں کا

آگے تھے کئی اب تو ہمیں ایک ہیں چوہے مار
مدت سے ہمارا ہے اس اچار کا بیوپار
گلیوں میں ہمیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں خریدار
برسے ہے پڑی کوڑی، روپئے پیسوں کی بوچھاڑ
کیا زور مزیدار ہے اچار چوہوں کا

بھولا رام بولا، میاں کہیں چوہوں کا اچار بھی ہوا ہے۔ کہنے لگے تم ہی تو بیچتے ہو اور

دونہ منگا کر سامنے رکھ دیا۔ وہ بیچارہ بڑا خفیف ہوا اور سب نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ ایسی اکثر باتیں مشہور رہیں۔"[۱۰]

vi۔ ڈرامائی انداز:

انور مسعود کی پنجابی نظمیں ڈرامائی انداز کی حامل ہیں۔ جس طرح ڈرامائی تشکیل کا انحصار پلاٹ، کہانی، کرداراور مکالموں پر ہوتا ہے بالکل اسی طرح انور مسعود کی نظمیں جاندار پلاٹ، کہانی کے عام چلتے پھرتے زندہ کرداروں اور ان کے درمیان دلچسپ مکالمات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کی نظم ''اَج کیہ پکایئے'' ڈرامائی تشکیل کے بعد پاکستان ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ ہو چکی ہے۔ ''جہلم دے پُل تے، حال اوئے پاہریا، تندور'' اور'' رکشے والا'' ڈرامائی عناصر سے بھرپور نظمیں ہیں۔ ان کے کردار متحرک ہیں اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق بات کرتے ہیں۔ ''اَج کیہ پکایئے'' کے چودھری کے لہجے سے رُعب ودبدبہ صاف دکھائی دیتا ہے جبکہ اس کا ملازم ''رحماں'' اپنی باتوں سے ہی دیہات کا چاپلوس ملازم معلوم ہوتا ہے جس کا فرض چودھری کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کچھ نہیں۔ ''پٹ سیاپا'' میں انجام وہی دکھایا گیا ہے جو ہمارے معاشرے کے زیادہ تر گھروں میں بہو کی شکست پر منتج ہوتا ہے۔ ان کی نظموں کے کردار عملی زندگی کے کردار ہیں جن کو شاعر نے اپنے آس پاس گھومتے پھرتے، باتیں اور لڑائی جھگڑے کرتے دیکھا ہے۔ ڈرامے کی طرح نظموں کے آغاز میں قارئین کی توجہ بے اختیار حاصل کر لیتے ہیں اور آہستہ آہستہ ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اُن کی دلچسپی، انہماک اور محویت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ نظموں کے واقعات میں آغاز سے انجام تک ربط و تسلسل کی وجہ سے روانی پائی جاتی ہے۔ انور مسعود نظم کے قصے میں دلچسپی کا عنصر برقرار رکھنے کے لیے جو غیر متوقع حالات پیدا کرتے ہیں اسے ڈرامے کی اصطلاح میں ''کشمکش'' پیدا کرنا کہتے ہیں۔ یہ سب دلائل

ثابت کرتے ہیں کہ انور مسعود کی شاعری میں ڈرامائی پہلوؤں کی فراوانی ہے۔

نظیر کی نظموں میں ڈرامے کی طرح پلاٹ پر بہت زور ہے۔ ان کی نظموں کی کہانیوں سے با آسانی ڈراموں کے سین ترتیب دیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ کردار نگاری خام ہے لیکن کرداروں کا حلیہ، بناؤ سنگار اور قد کاٹھ بیان کرتے ہوئے قاری کو اُس کے سحر میں لے لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم ''خواب کا طلسم'' میں ''کافرسی مہ لقا'' کا حلیہ بیان کرتے ہوئے مخمس کے آٹھ بند کہ گئے ہیں۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

خون ریز ابرو، جان کی قاتل ہر اک نگاہ
مژگاں وہ برچھیوں کو لیے تل رہی سپاہ
مہندی سے انگلیوں نے کیے خون بے گناہ
آنکھوں میں کھچ رہا تھا وہ کاجل غضب سیاہ
پڑ جائے جس سے دل میں فرشتوں کے ہڑ بڑی

زلفیں وہ مشک ناب سی، چہرہ وہ چاند سا
جگنوں رہا گلے میں ستارہ سا جگ مگا
گہنے کا وصف یا کہ بدن کی کہوں صفا
جاتا تھا سرخ جوڑے میں تن یوں جھمک دکھا
گویا شفق میں آن بجلی چمک پڑی

عبدالمومن فاروقی، نظیر کی ڈراما نگاری کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''نظیر نے زندگی کا مطالعہ مختلف زاویوں سے کیا ہے۔ مشاہدۂ حیات کے وقت اُس پر اکثر غیر جانبداری اور بے خودی کا عالم طاری رہتا ہے۔ نظیر مختلف طبائع اور نوع بہ

نوع ادوار و کیفیاتِ حیات کو پیش کرتا ہے۔ ہستی کا مرقع دیکھنا ہو تو ''طفلی''۔ ''بچپن''۔ ''بڑھاپا''۔ ''جوانی''۔ ''فقراء کی شان''۔ ''من موجی''۔ ''بے خبری کا عالم''۔ ''کوڑی نہ رکھ کفن کو''۔ ''پیسہ ہی سب کچھ کرتا ہے''۔ ''ہر حال میں خوش''۔ ''مفلسی''۔ ''ہائے رے افلاس'' وغیرہ نظمیں ملاحظہ فرمائیں۔ ان نظموں میں کردار نگاری کی بہت سی خام و پختہ مثالیں آپ کو ملیں گی۔ اگر نظیر ڈرامہ لکھتا تو اسی مواد سے بہت سے مشخص کردار پیدا کر لیتا۔''[۱۱]

انور مسعود اور نظیر اکبر آبادی کے فن و شخصیت کے اس مختصر سے مطالعے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ فنی و فکری اور شخصی حوالے سے دونوں میں کافی اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس مماثلت کے باوجود کئی اختلافی پہلو بھی نکلتے ہیں جو انور مسعود کو نظیر سے جدا کرتے ہیں۔ نظیر کی شاعری میں ابتذال کا عنصر پایا جاتا ہے اور کلامِ انور اس خامی سے مبرا ہے۔ انور مسعود کی کردار نگاری نظیر سے کئی درجے بہتر ہے۔ انور مسعود کی شاعری ایجاز و اختصار کی عمدہ مثال ہے جبکہ نظیر کی نظمیں طویل ہیں۔ منظر نگاری کے میدان میں نظیر، انور مسعود سے آگے بڑھ جاتے ہے لیکن شگفتگی میں پھر مات کھا جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ شخصیت کے حوالے سے دونوں شعرا ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں اور نظیر کی اردو شاعری کی طرح انور مسعود کی پنجابی شاعری میں عوامی رُجحان غالب ہے جس کے بارے میں وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ:

''۔۔۔ پنجابی میں خاص طور پر میں نے لوگوں کے ہونٹوں سے باتیں لے کر اُن کے کانوں کو واپس کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔''[۱۲]

اس مختصر جائزے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر، ہم انور مسعود کو پنجابی شاعری کا نظیر اکبر آبادی کہہ سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالمومن الفاروقی، ۱۹۸۶ء، مقدمہ ''کلیاتِ نظیر'' نظیر اکبرآبادی، لاہور نمبر ۲۵، مکتبہ شعروادب، سمن آباد، بارھواں ایڈیشن، ص ۳

۲۔ ایضاً، ص ۷۰، ۷۱

۳۔ ایضاً، ص ۴۵

۴۔ ایضاً، ص ۴۰

۵۔ ایضاً، ص ۸۰

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ۲۰۰۶ء، ''تاریخِ ادب اردو''، جلد سوم، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ص ۱۰۰۷

۷۔ عبدالمومن الفاروقی، مقدمہ ''کلیاتِ نظیر'' نظیر اکبرآبادی، ص ۵۰

۸۔ ایضاً، ص ۴۷

۹۔ ایضاً، ص ۹۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۴، ۴۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۲۔ خط انور مسعود بہ نام راقم، بہ تاریخ ۲۹ اپریل ۲۰۰۸ء

۞۞۞

پروفیسر شمس القمر عاکف

تعلّی کی روایت کا پس منظر

اردو شاعری بالخصوص غزل میں تعلّی کا پس منظر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دیگر روایات کی طرح یہ روایت بھی عربی اور فارسی شاعری سے اردو میں منتقل ہوئی۔ اردو غزل کی نشو و نما کرنے والے شعرا کے سامنے فارسی غزل اور اس کی روایات تھیں جب کہ فارسی شاعری نے عربی شاعری سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ تعلّی کی روایت کی جڑیں عربی شاعری میں واضح نظر آتی ہیں۔ اہلِ عرب میں شاعری کا چرچا عام تھا۔ ہر قبیلے میں شاعر کی ذات پر فخر کیا جاتا تھا اور شاعر کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ عربوں نے فنِ شعر کو مختلف طبقات اور اصناف میں تقسیم کیا ہے جن میں سے ایک فخریہ شاعری ہے۔ اہلِ عرب ہمیشہ سے دوسری اقوام کے مقابلے میں خود کو عظیم اور برتر سمجھتے ہیں اور خود آپس میں بھی اُن کے قبائل ایک دوسرے کے مقابلے میں خود کو اعلیٰ خیال کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ شعر سے اخبار یا کتبے کا کام لیتے تھے۔ ہر قبیلہ اپنے تاریخی حالات، اپنے اخلاق و عادات، اپنی قومی خصوصیات اور فضائل و مفاخر کا اظہار شعر ہی کے ذریعے کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہاں شاعری نے اس قدر اثر پیدا کر لیا کہ قبائل کی حالت کو بدلنا، جنگ پر ابھارنا، امن اور صلح قائم کر دینا، حقیر کو معزز اور معزز کو حقیر بنا دینا سب کچھ شاعر کے قبضۂ قدرت میں آ گیا۔ عربی شاعری میں فخریہ شاعری کے دفتر کے دفتر لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی قبل از اسلام کی عربی شاعری کی تاریخ میں بیان کرتے ہیں: "فخر و حماسہ جاہلی شاعری کے محبوب اصناف میں سے ہے۔ اس صنف میں شاعر اپنی، اپنے آباؤ اجداد کی اچھائیاں، ان کے نیک کام، ان کی بہادری، شجاعت، ان کی تعداد اور حسب نسب میں برتری کے قصے سنا کر دوسرے قبائل کے مقابلے

میں فخر کرتا ہے اور جنگ وجدل کے موقع پر بھی انھی فضائل کو سنا کر جوش پیدا کرتا ہے۔فخر وحماسہ عربی کی اتنی ممتاز اور نمایاں صنف ہے کہ ابوتمام اور بحتری نے حماسہ کے نام سے دورِ جاہلی کی فخریہ اور جوشیلی شاعری کے مجموعے مرتب کیے ہیں"۔(1)

عربی میں احساسِ تفاخر پر مبنی شاعری زمانۂ قبل از اسلام ہی میں نہیں بعد کے ادوار میں بھی مسلسل ہوتی رہی۔ ہر دور کے شعرا کے ہاں فخریہ اشعار کی موجودگی اسے عربوں کا ایک عام اور پسندیدہ رجحان ثابت کرتی ہے۔

عربی شاعری کے معلوم ادوار میں سے پہلے دور کو زمانۂ جاہلیت کی شاعری کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ دور اسلام کی روشنی پھیلنے سے پہلے کا ہے۔اس دور کے مشہور شاعر المرکش الاکبر کا اظہارِ تفاخر ملاحظہ ہے:

انی لمن معشر افنی اوائلهم

قول الکما ة الا این المحامد نا

ترجمہ: میں ایسے لوگوں کا فرد ہوں کہ ان کے پرکھوں کو بہادروں کے اس قول کو ختم کر دیا ہے کہ ہمیں بچانے والے کہاں ہیں؟ یعنی ہمارے آباؤ اجداد اتنے بہادر تھے کہ بڑے بڑے بہادر بھی انھیں مدد کے لیے پکارتے تھے(2)۔

اسی دور کا شاعر عمرو بن کلثوم اپنی بڑائی یوں بیان کرتا ہے:

ونشرب ان وردناالماء صفوا

ویشرب غیر نا کدراوطینا

اذابلغ الفطام لناصبی

تخر له الجبابرساجدینا

ترجمہ:(1)اور جب ہم گھاٹ پر پانی پینے کے لیے آتے ہیں اور صاف ستھرا پانی پیتے ہیں

اور ہمارے علاوہ دوسرے لوگ گدلا اور مٹی ملا پانی پیتے ہیں۔

(2) جب ہمارا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی عمر کو آتا ہے تو اسی وقت اس کے سامنے بڑے بڑے جابر لوگ سجدہ کرنے لگتے ہیں (3)۔

عربی شاعری کے دوسرے بڑے دور کو اموی دور کا نام دیا گیا ہے جسے صدرِ اسلام کا دور بھی کہا جاتا ہے۔فرزدق اس دور کا نمایاں ترین شاعر ہے جو اپنے خاندان کے اونچے رتبے کی وجہ سے اپنی شاعری پر فخر کا خوب اظہار کرتا تھا۔اس میدان میں اسے اپنے زمانے کے تمام شاعروں پر فوقیت حاصل تھی۔فرزدق کے احساسِ افتخار کا رنگ کچھ یوں ہے:

تری الناس ان سرن یسیرون خلفنا

وان نحن أو مأنا الی الناس وقفوا

ترجمہ: لوگوں کو دیکھو گے کہ جب ہم چلیں تو وہ ہمارے پیچھے چلتے ہیں اور اگر ہم انھیں اشارہ کردیں تو وہ رُک جاتے ہیں (4)۔

شاعرِ رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا شمار بھی اسی دور کے مقبول شعرا میں ہوتا ہے۔آپ نے جہاں رسولِ کریمؐ اور اسلام کے دفاع میں غیر مسلم شعرا کو منہ توڑ جواب دیا وہیں آپ اپنے اشعار میں اپنی شاعرانہ خوبیوں اور زبان کی قوت پر فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

لسانی صارم لا عیب فیه

وبحری لا تکدره الدلاء

ترجمہ: میری زبان کاٹ والی ہے اور اس میں کوئی عیب نہیں اور میرا دریا ایسا ہے کہ ڈول ڈالنے سے گدلا نہیں ہوتا (5)۔

ابوالطیب احمد المتنبی عرب کی صحرائی فصاحت و بلاغت میں قدرت تامہ رکھنے والا کوفی

شاعر گزرا ہے جس نے اپنی طاقتِ لسان اور زبان دانی کے بل بوتے پر نبوت کا دعویٰ کیا لیکن قید ہونے پر تائب ہوا، اپنی شاعرانہ خوبیوں پر یوں فخر کرتا ہے۔

اجزنی اذا انشدت شعرا فانما

بشعری اتاک الماد حون مرددا

ودع کل صوت بعد صوتی فاننی

انا الصائح المحکی والآخر الصدا

ترجمہ: جب کہ تو کسی کا شعر سنے تو صلہ مجھ کو دے کیونکہ مداح لوگ میرے ہی شعر کے مضمون کو دوبارہ باندھ لاتے ہیں۔ میری آواز کو سن کر دوسرے کی آواز مت سنو کیونکہ اصل آواز میری ہے اور دوسری آواز گونج ہے (جو میری آواز کی نقل ہے)(6)۔

عہدِ حاضر کی عربی شاعری میں بھی فخر وحماسہ یا تعلّی کے عناصر بہ کثرت نظر آتے ہیں۔ مشہور شاعر ابنِ نباتہ (م۔ 1366ھ) اپنے شعر کے حسن پر کچھ یوں نازاں ہیں۔

کان الفاظهافی السمع حسدها

کواکب الرجم یحر قن الشیاطینا

ترجمہ: اس (میری شاعری) کے الفاظ اس کے حاسدوں کے کانوں میں اس طرح پڑتے ہیں جیسے رجم کرنے والے سیارے شیاطین پر آگ برساتے ہیں (7)۔

عربی قصیدوں کے ابتدائی حصے نسیب میں اپنے حسب نسب کا فخر کے ساتھ بیان عربی شاعروں کا پسندیدہ شیوہ رہا ہے۔ قصیدے کا یہی حصہ ایران میں ایک جداگانہ حیثیت اختیار کر کے غزل کہلایا تو فخریہ اشعار کا رواج غزل میں بھی در آیا۔ فارسی شعرا کے سامنے عربی شاعری بطور نمونہ موجود تھی جس کی روایات فارسی شاعری کا حصہ بنتی گئیں۔ عربوں اور برصغیر کے مسلمانوں کے اجتماعی شعور میں یکسانیت نے فارسی شعرا کو عربی شاعری کے

رجحانات کی طرف خوب مائل کیا چنانچہ عربوں کی فخریہ شاعری کے انبار دیکھ کر فارس کے شعرا نے بھی یہی شیوہ اختیار کیا۔ فارسی میں قصیدے اور غزل کی صنف نے شہرتِ عامہ پائی اور دونوں میں تعلی کے اشعار نے جگہ بنائی۔ قصیدے کی ابتدا یعنی تشبیب یا نسیب میں جب کہ غزل کے کسی بھی شعر بالخصوص مقطعے میں شاعر کا اپنے کمالات کی داد خود دینا ایک عام رجحان بنتا گیا۔ قصیدے بادشاہوں اور امرا سے طلبِ جاہ کا ذریعہ تھے لہٰذا تشبیب کے اشعار یا قصیدے کے اختتام پر اپنے شاعرانہ کمالات کو خوب اجاگر کرتے۔ شاعر اپنے آپ کو شاعروں کا امام اور رستمِ معانی کہتے اور ممدوح کو اپنے دُرِ سخن کا جوہری قرار دے کر اپنے تاب دار گوہروں کو اس کی نظر چڑھانے کی سعی کرتے اور مراد پاتے۔ اسی طرح غزل کے اشعار بالخصوص مقطعوں میں شعرا نے تعلی کے مضامین باندھ کر اپنے انفرادی اوصاف کی طرف خاص و عام کو متوجہ کیا۔ فارسی غزل کے دو نام ور شعرا امیر خسرو اور حافظ شیرازی کے تعلی پر مبنی اشعار بطور مثال درج کیے جاتے ہیں۔

امیر خسرو:

معطر از اں می کند گل چمن را
کش از نظمِ خسرو ذخیرہ ست بوہا (8)

حافظ شیرازی:

بیا بخواں غزل خوب و طرفہ و پر سوز
کہ شعرِ تست فرح بخش و جاں فزا حافظ (9)

چہ جائے گفتۂ خواجہ و شعر سلمانست
کہ شعرِ حافظِ شیراز بہ ز شعرِ ظہیر (10)

عراق و پارس گرفتی بہ شعر خوش حافظ
بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریز است (11)

اردو شعرا نے فارسی شعرا کی خود ستائی کی یہ روایت اپنائی اور ابتدا ہی سے اردو

مثنوی، قصیدے، قطعے سمیت غزل کے اشعار میں تعلّی کے مضامین باندھنا شعرا نے اپنا شیوہ بنالیا۔

حوالہ جات:

(1) ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، عربی ادب کی تاریخ، جلد اول، ص143

(2) ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، عربی ادب کی تاریخ، جلد اول، ص197

(3) ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، عربی ادب کی تاریخ، جلد اول، ص122

(4) محمد کاظم، عربی ادب کی تاریخ، دورِ جاہلیت سے موجودہ دور تک، ص134

(5) محمد کاظم، عربی ادب کی تاریخ، دورِ جاہلیت سے موجودہ دور تک، ص103

(6) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، انتخابِ دیوان المتنبی، ص37

(7) محمد کاظم، عربی ادب کی تاریخ، دورِ جاہلیت سے موجودہ دور تک، ص351

(8) امیر خسرو، کلیاتِ غزلیاتِ امیر خسرو، جلد اول، ص194

(9) حافظ شیرازی، دیوان حافظ، مترجم قاضی سجاد حسین، ص268

(10) حافظ شیرازی، دیوان حافظ، مترجم قاضی سجاد حسین، ص234

(11) حافظ شیرازی، دیوان حافظ، مترجم قاضی سجاد حسین، ص110

شاکر کنڈان

چوکھمبیاں۔اختراع اور نعتیہ چوکھمبیاں

اصناف سخن کی بانٹ دوصورتوں میں کی گئی ہے(1) فکری   (2) فنی
فکری بانٹ یا تقسیم میں فکر کی کوئی حد یا قید نہیں ہوتی ، پاتال سے عرش تک اور افق سے آفاق تک جو بھی سوچ کی حد ہے اس کے اندر مضامین اور موضوعات کے حوالے سے بات کی جاسکتی ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کی مزید اقسام ترتیب دے کر کچھ حدیں مقرر کردی گئی ہیں اور انہی حدود میں ایک حد نعت بھی ہے۔

فنی حوالے سے ہیئت کی پابندی فکر پر کہیں لازم ہوتی ہے اور کہیں آزاد۔شاعری میں ہیئت کے تجربات ابتداء سے ہورہے ہیں ، ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔لمحہ موجود میں شعروسخن کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فنی تجربات میں بے شمار ہیئتیں شامل ہو چکی ہیں۔اس میں اپنی دھرتی پر جنم لینے والی اصناف ،غیر ملکی اصناف اور اختراعی اصناف سخن شامل ہیں یہ سلسلہ رکا نہیں بلکہ نت نئے تجربایت روپذیر ہورہے ہیں۔ان میں بہت سے تجربات یا اختراعات ایسی ہیں جو بہت معمولی فکری اور فنی تبدیلی کے ساتھ سامنے آئی ہیں ۔جیسے تین مصرعی اصناف سخن میں ہائیکو، سرائیکو،سین ریو، مثلث سہ مصرعی ، سہ گانی، سہ الگی، ترو ینی ، ثلاثی ، چسیاں وغیرہ ہیں اسی طرح چہار مصرعی تجربات میں ہیئت کی بہت ہی معمولی تبدیلی سے جو اصناف سامنے آئیں ان میں مربع جس کے چاروں مصرے ہم وزن ، ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں اس میں ہر بحر کو اپنے دائرے میں پابند رکھتے ہوئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔البتہ جب یہ نظم کی صورت میں کئی بندوں پر مشتمل ہو تو پھر مربع ایک ہی بحر میں اوزان کی پابندی کے ساتھ اپنے الگ قافیہ ردیف کی پابندی کے ساتھ ہوگا یا ہر مربع کا چوتھا مصرع پہلے بند کے چوتھے مصرع کے قافیہ ردیف کو اپنائے

ہوئے ہوگا۔اس میں مزید ردوبدل کے ساتھ مربع لکھا جا رہا ہے۔ یوں ہر مربع ایک بند کہلاتا ہے۔

رباعی کے بھی چار مصرعے ہوتے ہیں جو بحر حزج کے اوزان اخرب واخرم (چوبیس کی تعداد) کے دائرہ میں لکھی جاتی ہے۔رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ، ہم ردیف یا غیر مردف ہونے کی صورت میں ہم قافیہ ہوتا ہے ۔اس میں چار ہم وزن مصرعوں میں مکمل مضمون باندھنا ہوتا ہے ۔اس میں فکری پابندی نہیں بلکہ ہئیت کی پابندی ضروری ہے۔

دوہڑا پنجابی زبان سے اردو زبان میں آیا۔اگر چہ یہ سنسکرت چھند شاستر یا ہندی پنگل کے مدِ نظر لکھا جاتا ہے لیکن اردو کی مروجہ بحور میں بھی اس کی تقطیع کی جاتی ہے۔ عام طور پر دوہڑے کا ہر مصرع میں سات یا آٹھ ارکان ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن،

یا

فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن

لیکن کبھی کبھی اسے فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع کے ارکان میں بھی لکھا جاتا ہے ۔ان کے علاوہ چار مصرعی صنف سخن میں ڈیوڑھا بھی لکھا جاتا ہے ۔اس میں ہر مصرع میں وقفہ دیتے ہوئے دو ارکان کا مزید اضافہ کر دیا جاتا ہے۔اور یہ ہیئت ایسے ہی ہے جیسے اردو زبان میں ہم مستزاد لکھتے ہیں۔ یوں اس کے ارکان اس ہئیت میں ظاہر ہوتے ہیں:

فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن ــــــــ فعلن فعلن

قطعہ میں اگر چہ شعروں کی تعداد مخصوص نہیں ہوتی لیکن سہل انگاری نے اسے بھی چار مصرعوں تک محدود کر دیا ہے۔آج اکثر قطعات چار مصرعوں کے ہی لکھے جا رہے ہیں ۔ان میں دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے ۔اس میں چوتھا مصرع یعنی آخری

مصرع پورے مضمون کا اختتامیہ اور زور دار ہوتا ہے۔

انہی چومصرعی اصناف میں ایک اور اضافہ چوکھمبیاں کے نام سے جناب یوسف راہی چاٹگامی نے کیا ہے۔اس وقت میرے سامنے نعتیہ چوکھمبیاں کا مسودہ موجود ہے جسے دیکھ کر ذہن میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ شاید ہر چوکھمبی پانچ مصرعوں پر مشتمل ہے جس میں ایک مصرع تکرار کا ہے جبکہ چوکھمبی پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ دیکھنے اور سمجھنے میں بہت فرق ہے۔اگر اضافی مصرع کو چوکھمبی کا جز سمجھ لیا جائے تو پھر نام کی پوری تفہیم بگڑ جاتی ہے جس سے یہ چوکھمبی نہیں بلکہ پنج کھمبی یا خمسہ بن جاتی ہے۔دراصل دکھائی دینے والی اس ترجیح بند کی رعایت سے ایک فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ظاہراً دکھائی دینے والا یہ اضافی مصرع میرے نزدیک اس نظم کے مضمون کو واضح کرنے،حسن پیدا کرنے اور چوکھمبی کے مرکزی نکتہ سے آگاہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے جیسے نظم کا عنوان بھی کہا جا سکتا ہے۔

مذکورہ مصرع جسے میں نے عنوان یا مرکزی نکتہ خیال کیا ہے کو اگر گہرائی میں دیکھا اور بغور پڑھا جائے تو اس سے چوکھمبی کے اس مرکزی نکتہ کی وضاحت اور اہمیت جس طرح اجاگر ہوتی ہے اسے مندرجہ ذیل مثالوں میں ملاحظہ فرمائیں:

بشر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بے نور تھا

یہ ہر اک برائی سے معمور تھا
مدد غیر سے اس کا دستور تھا
حقیقت سے توحید کی دور تھا
بشر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بے نور تھا

اس مصرع میں جناب یوسف نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے کے زمانے یعنی زمانۂ جاہلیت پر بحث کرتے ہوئے دوادوار کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ظاہراً تو قبل

بعثت کے عہد پر بات کی ہے جس سے اس بے نور عہد کی برائیوں اور خامیوں کا ذکر کیا ہے اور اسے بھی چند الفاظ میں مفصل تحریر کر دیا ہے، اور دوسرا اہم نکتہ جسے بین اللفظ واضح کیا ہے وہ آپ ﷺ کی بعثت کے بعد کا زمانہ ہے جبکہ آپ ﷺ کی آمد کے بعد اور برائیوں اور خامیوں والا دستور قلم کی ایک جنبش سے تبدیل ہو گیا اور وہ شرک میں مبتلا ہونا، توحید سے دوری، برائیوں کے جھمگٹ، تاریکی اور جہالت سب کی نفی ہو گئی۔ اب دستور بدل گیا اور روشنی ڈیرہ جمانے لگی۔

ایک اور چوکھمبی ملاحظہ ہو:

رضائے الٰہی میں سب ان کے کام
کرو ان کی تقلید تم صبح و شام
رضائے الٰہی میں سب ان کے کام
انہی کاموں کا تم کرو اہتمام
کرو ان کے اعمال و اقوال عام

اس چوکھمبی میں "رضائے الٰہی ہیں سب ان کے کام" دوسرا مصرع ہے۔ اس مصرع نے اپنی اہمیت اور چوکھمبی کے اس مرکزی خیال کو کچھ یوں اجاگر کیا ہے کہ:

حضور نبی کریم ﷺ کی تقلید ہم پر فرض ہے آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کیا وہ انھوں نے اپنی طرف سے نہیں فرمایا نہ کیا بلکہ وہ کلام اللہ کا ہے اور زبان آپ ﷺ کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ یہ تیر جو تم نے پھینکے ہیں یہ تم نے نہیں بلکہ ہم نے پھینکے ہیں۔ نیز رسول ﷺ جو بات بھی فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے جس کا ماننا اللہ تعالیٰ کی بات کا ماننا ہے گویا جب فرائض اور احکامات کو سمیٹا گیا تو اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ حضور نبی کریم ﷺ کے تمام کام رضائے الٰہی کے مطابق

ہوتے ہیں۔

درج بالا چوکھمبی میں اس مصرع کی اہمیت کا اندازہ رضائے الٰہی کے لفظ کو کھول کر سمجھنے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دیگر چوکھمبیوں کا محور اور اہم نکتہ اس مصرع میں مضمر ہے جو عنوان کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ جناب یوسف راہی چاٹگامی کی خواہش تھی کہ ہر چوکھمبی کو کوئی نہ کوئی عنوان دیا جائے لیکن اس پابندی سے بعد میں چوکھمبی لکھنے والے شعراء کے لیے ہر چوکھمبی کا عنوان دینا مشکل ہو جاتا لہٰذا چوکھمبی ہی کی طرح ایک آسانی پیدا کر دی گئی اور اپنی خواہش کی تکمیل بھی اس میں سے ایک مصرع کو اوپر درج کر کے کر دی گئی جس سے مرکزی نکتہ کی اہمیت بھی اجاگر ہو گئی۔ ان نعتیہ چوکھمبیوں میں سے اکثر ایسی ہیں جو تلمیحاتی ہیں یعنی ان کا مطالعہ تاریخ اسلام اور سیرت نبوی ﷺ کے کئی در وا کر دیتا ہے۔ قبل از بعثت اور بعد از بعثت کی تاریخ کے اوراق نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ گویا یوسف راہی کہیں سیرت نگار کے روپ میں، کہیں موئرخ کی حیثیت سے نیز کہیں مبلغ کے رنگ میں اور کہیں مصلح کی صورت دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نعت کے پس منظر میں سماج اور اس کی برائیوں سے جہاں پردہ ہٹاتے ہیں وہیں نیکی اور صراط مستقیم کی طرف مراجعت اور نقش پائے حضور کریم ﷺ پر چلنے کی دعوت دیتے ہوئے اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ مغفرت اور بخشش کا راستہ حضور کریم ﷺ کی اطاعت اور تقلید کا راستہ ہے۔

"چوکھمبیاں" پڑھتے ہوئے مجھ پر کئی کیفیات وارد ہوئیں میں نے خود کو مدینۃ النبی ﷺ کی گلیوں میں بھی پایا۔ دربار تقدس کی سنہری جالیوں کے سامنے گناہوں کے احساس سے سر خم کیے اور نگاہیں تر کیے بھی خود کو دیکھا۔ ریاض الجنہ میں بارگاہ رب العالمین کے حضور اس کی ذات کا شکر ادا کرتے ہوئے بھی پایا۔ سبز گنبد سے چھن چھن کر آتے سبز اجالوں کا دیدار بھی کیا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جنت کی پرسکون فضا میں بیٹھا ہوا جب نظر اٹھاتا

ہوں تو ایک وسیع ،خوبصورت اور پاک منظر آنکھوں کے راستے دل میں اتار لیتا ہوں اور لبوں پر درود وسلام کے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں۔ الغرض جب میرے جیسا آدمی ان چوکھمبیوں کے مطالعے کے دوران ایسی کیفیات سے گزرتا ہے تو اس شخص کے جذبات اور احساسات کا اندازہ کیسے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ان الفاظ کے نزول اور قرطاس پرا کیلے وقت کن کیفیات سے گزر رہا ہوگا۔وہ شخص تو سرتاپا رحمتِ رحمت للعالمین میں نہایا ہوگا۔اس کارواں رواں درودوسلام میں محو ہوگا۔اس کیفیت اور سوچ پر مجھے اپنی قسمت پر بھی رشک آیا۔ میں نے شہرآقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوتر خاک کو بوسہ دیتے ہوئے محسوس کیا اور چونکہ یہ سب منظر نعتیہ چوکھمبیاں کے باعث ہوالہذا یوسف راہی چاٹگامی پر بھی رشک آیا اور دعا کے لیے خود بخود ہاتھ اٹھ گئے۔آخر میں مجھے چوکھمبی پر تھوڑی سی بحث کرنی ہے۔چونکہ یہ ایک نومولود صنف سخن ہے جب اسے فروخ ملے گا تو کئی پرت الٹے جائیں گے۔فی الحال تو اسے ہئیت اور صنف کے حوالے سے پہچاننا اور آگاہی حاصل کرنا ہے۔چوکھمبی پر جناب محسن ملیح آبادی نے سیر حاصل بحث کی ہے انھوں نے یوسف راہی کی اس اختراع کو بحر متقارب مثمن سالم سے مخصوص لکھا ہے, جس کے ارکان ایک مصرع میں چار بار فعولن فعولن فعولن فعولن ہیں۔محسن ملیح آبادی مزید لکھتے ہیں کہ اس بحر کے آخری رکن یعنی عروض وضرب کو تسبیغ بھی کر دیتے ہیں یعنی ایک حرف زیادہ کر کے مسبغ کر دیتے ہیں۔فعول کی بجائے فعولان ہو جاتا ہے اور عروض وضرب یعنی آخری رکن مقصود یا محذوف کرنے کی اجازت بھی عروضیوں نے دی ہے۔یعنی فعولن کی جگہ فعول یا فعل بھی کر سکتے ہیں۔بہر حال معمولی سی اس ردوبدل سے ایک خاص بحر میں کہے گئے یہ چومصرعے ایک الگ تجویز کردہ عروضی ہئیت کے ساتھ ایک نئے نام سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ان چوکھمبیوں کے پڑھتے ہوئے کہیں بھی قاری کو رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔یوں لگتا ہے ایک دریا ہے جو اپنی دھیمی رفتار میں بڑے

سکون سے بہے جا رہا ہے۔ یہ ایک داستان ہے جو تسلسل اور دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے بلکہ یہ کہنا افضل ہو گا کہ منظوم سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کے مطالعے میں قاری منہمک بھی ہے اور چاشنی سے بھرپور حظ بھی اٹھا رہا ہے۔ وہ حظ جس کا تعلق روح کی پوتر تا سے ہے۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ تسلسل اگرچہ اس صورت نہیں جو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قرطاس پر تحریر کیا ہو بلکہ یوں کہہ لیں کہ یہ آمد کی شاعری ہے آورد کی نہیں۔ آمد میں تاریخی تسلسل نہیں ہوتا بلکہ عقیدت وانسیت اور عطا کی روانی ہوتی ہے۔ ان چوکھمبیوں میں حالات اور فکر کی یک جائی کا جو احساس ابھرتا ہے وہ جذبے کو کم نہیں کرتا بلکہ مہمیز لگاتا ہے اور قاری جب یکسوئی کے ساتھ اسے پڑھ رہا ہوتا ہے تو وہ ایک نئی لذت کے ساتھ آشنا ہوتا ہے۔ اسے عشق کی ایک نئی اور عجیب چاشنی سے آگاہی ہوتی ہے۔ عشق جو ایک ابدی موضوع ہے اور مختلف مدارج کے بعد نام پاتا ہے؛ وہ یہاں اپنے اونچے مقام پر دکھائی دیتا ہے۔ یہ عشق وہ ہے جس کے ڈانڈے صوفیانہ عقائد سے ملائے گئے ہیں۔ جو علامہ محمد اقبالؒ کے ہاں دانش نورانی سے تعبیر کیا گیا ہے بلکہ اگر مجھے اجازت دیں تو میں ان نعتیہ چوکھمبیوں کے مطالعے کے دوران مرتب ہونے والے اثرات کے مدنظر اس کیفیت کو جنون کہنے کی جسارت کرنا چاہوں گا کیونکہ جنون وہ کیفیت ہے جو ادراک سے ہم آغوش کرتی ہے اور اس کا تعلق انسان کی روح سے جا ملتا ہے جب تک ایک نعت گو شاعر خود کو اس کیفیت کے حوالے نہ کر دے وہ روح پرور شعر لکھنے سے عاری رہتا ہے۔ بہر حال ان نعتیہ چوکھمبیوں میں نہ تو بھاری بھر کم الفاظ استعمال ہوئے ہیں نہ تشبیہات واستعارات کا سہارا لیا گیا ہے اور نہ ہی علامتوں کی بھرمار ہے۔ ویسے بھی نعت میں تشبیہات واستعارات وعلامات مقام اور مرتبے کو کم کر دیتی ہیں، جب ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کو پھول بہار، کہکشاں، چاند ،بادل، سمندر، برگِ سبز یا کسی بھی دنیاوی شے سے تشبیہہ دیتے ہیں تو دل اسے ماننے کو تیار

نہیں ہوتا کیونکہ دنیا کی تمام چیزیں حضور ﷺ کی ذات سے کم تر ہیں ۔ یہ روشنیاں ، یہ رعنائیاں ، یہ خوبصورتیاں ، یہ تصورات حضور ﷺ کی شان اقدس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے ۔کیا پھول کی خوشبو حضور کے پسینہ اطہر جیسی معطر ہوتی ہے؟ کیا چاند اور ستاروں کی روشنی آپ ﷺ کے جلووں کے مقابل رکھی جا سکتی ہے؟ بالکل نہیں ۔ دنیا کی یہ اشیاء آپ ﷺ کی عظمت اور وقار کا صحیح تصور پیش کرنے سے قاصر ہیں ۔ سو یوسف راہی کی چوکھمبیوں کی سادگی تشبیات و استعارات کی خوبصورتی سے بہت افضل ہے ۔کائنات میں سب سے افضل ترین شے کی کیا مثال پیش کی جا سکتی ہے یا کوئی علامت مقابل رکھی جا سکتی ہے ۔وہ ہستی جس کے بارے میں اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ اے میرے محبوب اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو کچھ بھی پیدا نہ کرتا ۔گو یا یہ تمام دنیاوی اشیاء آپ ﷺ کے دم قدم سے ہیں ۔ان چوکھمبیوں میں ایک اور درست سمت جو مجھے دکھائی دی وہ ہے احد اور احمد کا فرق ان میں حمد کو اپنے مقام پر اور نعت کو اپنے مرتبے پر رکھا گیا ہے ۔نعتیہ شاعری میں اکثر جذبات کی رو میں بہہ کر خالق اور مخلوق کے فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔یوسف راہی نے جہاں کائنات میں سے افضل ترین ہستی کو قائم رکھا وہاں کائنات کے خالق کے مقام معلیٰ اور معبودیت کی حقیقت کو بھی برقرار رکھا ۔افضل البشر کا مقام متعین ہے کائنات بشر کے لیے اور بشر سے افضل ذات حضور نبی کریم ﷺ کی ۔ جب ہم اس سے آگے بڑھتے ہیں یعنی احمد کی م کو درمیان سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو الوہیت کی حد شروع ہو جاتی ہے ،م ہی تو خالق اور مخلوق کے درمیان حد فاضل ہے ۔ان چوکھمبیوں میں اس حد تک کا ادراک ہو رہا ہے اور یہی وہ ادراک ہے جسے چند سطور قبل میں نے جنون سے تعبیر کیا ہے ۔

عشق کے بارے میں آگاہ کرتا چلوں کہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ عشق کا لفظ تو عربی زبان میں ہے ہی نہیں بجا لیکن کچھ علاقائی روایات ایسے الفاظ کو جنم دیتی ہے جو کسی انتہا کو

ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارے جذبات بھی ہمارے علاقائی روایات اور تقاضوں کے تابع ہیں۔ لہذا عشق ہماری جغرافیائی حدود کا ایک لفظ ہے جو جنوں سے کم اور محبت سے بالا کی کیفیت کا اظہار یہ ہے۔ اسے جب مسلکِ عشق کا نام دیا جاتا ہے تو صوفیاء کے نزدیک یہ ایک غیر متزلزل وفا، اخلاص و استقامت اور جنوں پروری جیسے اوصاف کا منبع اور انتہائے محبت کی آبرو گردانا جاتا ہے۔ دراصل بات چوکھمبی سے جذبات کی رو میں بہہ کر عشق میں چلی گئی جبکہ میں چوکھمبی پر بات کرنا چاہتا تھا۔ اس اختراع کے حوالے میرے ذہن میں چند متضاد و متفق جن خیالات سے جنم لیا وہ نام کی نسبت سے ہیں۔ میرے سامنے جناب یوسف راہی چاٹگامی کی کی مطبوعہ کتاب" چوکھمبیاں اور مسودہ" نعتیہ چوکھمبیاں" موجود ہے۔ جس پر محسن ملیح آبادی کے مضمون" ایک نئی صنف سخن چوکھمبی کے مخترع یوسف راہی انتقادی آئینے میں" شفیق احمد شفیق کے مضمون" چوکھمبی: اردو ادب کی نئی صنف سخن" یا پھر یوسف راہی چاٹگامی کے اپنے مضمون" اردو ادب کی نئی صنف سخن" کے علاوہ ابھی اتک غالباً کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ اس لیے میں بھی ایک عام قاری کی طرح اس سے بالکل نابلد ہوں۔ میرے ذہن میں آئے ہوئے خیالات مجھے حقیقاً کسی نقطے پر لے جا کر ان اصحاب کی سوچ سے متفق کرتے ہیں لیکن" چَو" اور" چُو" کی زبر اور پیش کو میں نہیں سمجھ سکا۔ یہ اختلاف اتفاقیہ ہے یا اس کے پیچھے کوئی سوچ عمل پیرا ہے، مجھے اس کا علم نہیں۔ البتہ جو میں سمجھ پایا ہوں وہ یہ کہ یہ نام دو الفاظ کا مجموعہ ہے چو اور کھمبی۔ چو کو اگر زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ الفاظ چار کے معنی دیتا ہے اور یہاں اسے واضح بھی چار مصرعوں کے ساتھ کیا گیا ہے اگر اسے پیش سے پڑھا جائے تو اس کے معانی ملکیت یا والا کے ہوں گے یہ دونوں الفاظ ہندی اور سنسکرت میں استعمال ہوتے ہیں اور عموماً سابقہ کے طور پر آتے ہیں جو تکنیکی لحاظ سے بھی مرکب میں اساتذہ کے نزدیک درست ہے۔ اگر اس لفظ کو پیش کے ساتھ مانا جائے تو یہ لفظ مثل یا مانند

کے معنی میں آتا ہے اور اگر کے معنی بھی دیتا ہے جبکہ شیخ سعدی نے اسے ایک کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ اب جو لوگ اردو میں استعمال ہونے والے ہر لفظ کو اُردوایا ہوا مان کر اسے اردو کا لفظ تسلیم کر لیتے ہیں وہ مرکب میں اس پیچیدگی کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ لفظ فارسی اور ہندی کا مرکب ہے یا کسی ایک ہی زبان کا، سو وہ اسے اردو کا ہی لفظ مانتے ہیں اور ایسی ترکیب کو جائز تصور کرتے ہیں۔ دوسرا لفظ ہے" چوکھمبیاں" جو جمع ہے کھمبی کی۔ کھمبی کا ماخذ کھمب ہے۔ پنجابی زبان میں کھمب پرندے کے پر کو کہتے ہیں۔ کھمبی غالبا اسم تصغیر ہے۔ چوکھمبی کا مطلب چار چھوٹے پر ہوا۔ اگر اس سے مشتق " کھمبا" لیا جائے تو معنی ستون قرار پائیں گے جس سے مفہوم چار ستون یا Piller لیا جائے گا۔ یہ تو وہ عام تفہیم ہے جو غالبا یوسف راہی نے استعمال کی ہے اور اسی بناء پر اس اختراع کا نام چوکھمبی رکھا ہے لیکن اگر کھمبی کو زبر کی بجائے پیش سے پڑھا جائے تو لفظ کھمبی ایک برساتی پودے کو ظاہر کرے گا جس کی صرف ایک ڈنڈی ہوتی ہے اور اوپر چھتری سی بنی ہوتی ہے۔ یہ کھمبیاں دو طرح کی ہوتی ہیں ایک؛ زہریلی جسے پنجابی زبان میں پد پیڑا کہتے ہیں اور دوسری فطر یا کھمبی ہی کہلاتی ہے جو سبزی کے طور پر پکا کر کھانے کے کام آتی ہے، اسے انگریزی میں مشروم کہتے ہیں۔ مشروم کو اگر میپ کے علم میں پرکھا جائے تو یہ موضوع پھیل جائے گا اور اگر معنوی لحاظ سے دیکھیں تو چھتری دار خودرو پودا ہی ذہن میں آئے گا۔ اگر ہاتھ کو سر کے پیچھے سے لے جا کر کان کو پکڑیں تو اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ چار ستونوں پر کھڑی ہوئی وہ چھتری جسے شاعری کی اصطلاح میں تصوراتی بنیادوں پر چوکھمبی کے نام دیا گیا ہے۔ یہ خیالات ذہن میں اس طرح کی الجھن پیدا کرنے لگے کہ" چو" کو زبر اور پیش سے الگ الگ کیوں لکھا گیا۔ آخر اس کے پیچھے کوئی تو مقصد کارفرما ہو گا اگر ایسی ہی بات تھی تو اعراب لگانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لفظ کو آزاد رہنے دیا جاتا اور اسے قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیا

جاتا تو خواہ وہ "چَوکَھمبی" پڑھے" چُوکَھمبی" پڑھے یا چو"کُھمبی"۔کان کو آگے سے پکڑیں یا پیچھے سے مقصد ایک ہی ہے ۔ بہر حال جناب یوسف راہی چاٹگامی تحسین ہیں جو سوچتے ہیں، اختراع کو جائز اور ادب کے فروغ میں معتبر اور معاون گردانتے ہیں اور اسے عملی جامہ پہنانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے ۔ان کے ذہن میں یہ خیال کہیں بھی نہیں ہوتا کہ لوگ کیا کہیں گے؟ کیونکہ لوگ تو کہتے ہی رہتے ہیں ۔اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کام میں مگن اور محور ہنا ہی ارتقائی عمل ہے۔اوراسی سے زبانیں قائم رہتی ہیں۔

ارشد سیماب ملک

ماسٹر جگت سنگھ

ماسٹر جگت سنگھ نے اپنے رسالے کے ذریعے تمام عمر بھرپور صحافتی خدمات انجام دیں۔ان کی صحافتی خدمات اور رہنمائے تعلیم کا تذکرہ راقم نے اپنے مضمون 'اردو جریدہ نگاری اور تاریخ ساز رہنمائے تعلیم' میں تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں ان کے مختصر حالاتِ زندگی اور اوصاف حمیدہ کی نشاندہی کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

ان کا تعلق ضلع کیمبل پور (حال) اٹک پاکستان سے ہے۔ جہاں کی ایک تحصیل پنڈی گھیب میں ۲۰ مئی ۱۸۸۵ء کو ان کی ولادت لالہ بوٹا مل کے ہاں ہوئی۔

ان کی پرورش معاشی طور پر ایک غریب خاندان ہوئی جن کے ہاں تعلیم کا کوئی رجحان نہ تھا۔یہی وجہ تھی کہ ماسٹر جگت سنگھ نے ابتدائی تعلیمی عمر کے کچھ سال گاؤں کے دیہاتی ماحول میں دوسرے بچوں کی طرح کھیل گود میں بسر کر دیئے اور قدرے تاخیر سے انہیں سکول میں ڈالا گیا۔ جہاں انہوں نے ابتدائی جماعتیں پڑھیں اور پھر سولہ سال کی عمر میں مقامی مونسپل بورڈ سے ورنا کیولر مڈل کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد راولپنڈی سے ۱۹۰۲ء میں امتیازی نمبروں سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔

مالی حالات کے پیشِ نظر انہیں ملازمت کی ضرورت محسوس ہوئی اور جے۔ وی کے فوراً بعد ہی ضلع راولپنڈی کے نواحی علاقے گولڑہ میں ایک پرائمری سکول میں مدرس کی ملازمت مل گئی۔ جہاں انہوں نے اپنے فرائض انجام دیئے ہی تھے کہ انہیں جہلم کے لیے رختِ سفر باندھنا پڑا جہاں کے ایک مونسپل بورڈ ہائی اسکول میں آپ کا تقرر بحیثیت مدرس ہوا۔ جہاں انہوں نے انتہائی محنت اور دیانتداری سے درس وتدریس کا کام انجام دیا لیکن صرف نو ماہ بعد ہی اس اسکول کو بھی خیر آباد کہا اور شعبہء تدریس کے اعلیٰ درجے کے حصول

کے لیے ۱۹۰۴ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے مئی ۱۹۰۵ء میں ایس وی کا امتحان نہ صرف فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا بل کہ کالج کے تمام طلبہ میں اول پوزیشن حاصل کی۔

ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد ایس وی کی سند لے کر آپ اپنے آبائی قصبہ پنڈی گھیب تشریف لے آئے اور یہاں خالصہ سکول کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں کچھ عرصہ خود بھی مدرس کی خدمات انجام دیں۔ خالصہ سکول میں تدریسی فرائض انجام دینے کے ساتھ اساتذہ کو جدید اصولِ تعلیم کے تقاضوں سے انہیں باخبر رکھنے اور ان کے مطابق طلبا کو تعلیم دینے، اساتذہ کے جائز حقوق اور شکایات کو محکمہ کے حکامِ بالا تک پہنچانے کے لیے ایک ماہوار رسالہ کی ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ آپ نے ۱۹۰۵ء میں پنڈی گھیب ضلع کیمبلپور (اٹک) سے ایک ماہوار اردو رسالے کا اجراء کیا جو آگے چل کر اردو ادب کا طویل العمر پرچہ ثابت ہوا۔ اس کے ابتدائی حالات کے بارے میں آپ کچھ اس طرح سے رقمطراز ہیں:

''تعلیم سے فارغ ہو کر میں وطن چلا آیا اور وہاں خالصہ سکول کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا جس میں خود بھی پڑھاتا تھا۔ یہیں میں نے ۱۹۰۵ء ہی میں رسالہ رہنمائے تعلیم جاری کیا۔ اس کی ابتدائی حالت یہ تھی ۳۲ صفحات اور چھوٹی قطع کا بہت معمولی سا رسالہ تھا۔ میں اس کے خود ہی مضمون لکھتا تھا اور مسودہ خود ہی راولپنڈی لے جاتا کسی کاتب کی منت سماجت کر کے اپنے سامنے رسالہ لکھواتا۔ بازار جا کر خود ہی کاغذ لاتا اور مطبع والوں کی خوشامد کر کے خود کھڑے ہو کر چھپواتا۔ چھپے ہوئے فرمے سر پر اٹھا کر پنڈی گھیب لاتا اور انہیں خود ہی فولڈ کرتا اور خود ان کے پیکٹ بنا کر اور خود ہی ان کے ٹکٹ لگا کر خود ڈاک خانہ میں دے کر آتا یعنی ایڈیٹر بھی میں ہی تھا اور منیجر بھی تھا اور چپڑاسی بھی۔''[۱]

پنڈی گھیب میں رہ کر ماسٹر جگت سنگھ کسی صلہ یا ستائش کی بغیر بچوں کی تعلیم و تربیت میں مگن رہے لیکن اس کے ساتھ ہی فکرِ معاش ایسے مسائل نے انہیں الجھائے رکھا لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنے حوصلہ پست نہیں۔ انتہائی تنگ دستی اور کٹھن حالات میں بھی نو ماہ تک خالصہ سکول میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔

فروی ۱۹۰۷ء میں سنٹرل کالج لاہور کی جانب سے ورنیکلر ٹیچر کی تقرری کا لیٹر موصول ہوا تو انہوں نے لاہور کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اس متعلق ماسٹر جگت سنگھ اپنی مختصر آپ بیتی میں رقطراز ہیں:

''میں بڑی مفلسی اور غریبی کی حالت میں لاہور آیا تھا۔ گھر سے چلتے ہوئے ہمارے محلے کی ایک بوڑھی خاتون نے مجھے بلا کر پیار کیا اور کہنے لگی کہ بیٹا خدا حافظ، خدا تمھیں جلدی لائے اور تم لاہور میں خوش اور آرام سے رہو اور بڑی بی نے بڑی محبت کے ساتھ امام ضامن کے نام کا ایک روپیہ کپڑے میں لپیٹ کر میرے بازو پر باندھ دیا اور مجھے پیار سے رخصت کیا۔ لاہور کا ٹکٹ لینے کے بعد صرف دو آنے میرے پاس بچے تھے اور ایک روپیہ یہ تھا، یہ ایک روپیہ دو آنے میری کل دولت تھی جو لاہور اسٹیشن پر اترنے وقت میرے پاس تھی۔''۲

ماسٹر صاحب مختصر سے ضروری سامان کے ہمراہ اپنے آبائی قصبہ پنڈی گھیب سے براستہ راوال پنڈی ریلوے اسٹیشن رات کے وقت لاہو پہنچے۔ کھانا کھانے اور رات کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کی غرض سے نکلے ہی تھے کے موسم خراب ہو گیا اور چند قدم بھی نہ چل پائے تھے کہ موسلا دار بارش شروع ہو گئی۔ وہ اپنے سامان کو سمبھالتے ہوئے گرتے پڑتے ایک گھر کے سامنے بارآمدے میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ ابھی ٹھیک سے سانس بھی نہ لے پائے تھے کہ بیٹھک کا دروازہ کھلا اور مکان کے مالک سردار کش سنگھ نمودار ہوئے

۔انہوں نے ماسٹر جگت سنگھ کی پریشانی کو بانپ لیا اور تمام صورتِ حال جان لینے کے بعد پریشان حال ماسٹر صاحب کو اپنے ساتھ اندر لے گئے، نوکر سے سامان اٹھا کر اندر لیجانے کو کہا اور ان کے قیام طعام کا بندوبست کیا۔ پریشان حال ماسٹر صاحب رات بسر کرنے کے ٹھکانے کی تلاش سے آزاد ہوئے تو سکھ کا سانس لیا۔ سردار کشن سنگھ خوش اخلاق انسان ہونے کے ساتھ اچھے مہمان نواز بھی تھے انہوں نے ماسٹر صاحب کا سامان اپنے پاس رکھ لیا اور صبح کے ناشتے سے فراغت کے بعد ماسٹر صاحب کو سکول بھیج دیا کہ پہلے اپنا چارج لیں پھر اپنا سامان لے جایئے گا۔

ماسٹر صاحب اپنی نوکری کا چارج لینے اور بورڈنگ میں اپنی رہائش کا بندوبست کرنے کے بعد جب شام کو سردار کشن سنگھ کا شکریہ ادا کرنے اور اپنے سامان کی غرض سے ان کے ہاں پہنچے تو سردار کشن سنگھ نے ان سے یہیں ٹھہر جانے پر اسرار کیا اور ساتھ ہی اپنے بچوں کی تعلیمی ذمہ داری اٹھانے کی درخواست بھی کر دی۔ ماسٹر جگت سنگھ ان کے اخلاق اور مہمان نوازی سے پہلے ہی متاثر تھے اس لیے ان کی درخواست کو بخوشی قبول کر لیا اور اپنی ملازمتی ذمہ داریوں سے فراغت کے بعد سرادار صاحب کے بچوں کو پڑھانے لگے۔ سکول میں بھی وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت فرماتے اخلاقیات اور انسانیت کا درس دینے کے ساتھ حصول تعلیم پر زور دیتے۔ اپنے ہمعصر اساتذہ کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ دوستانہ رہا۔ کبھی بھی کسی بھی موقعہ پر مسلک یا مذہب کو بنیاد بنا کر کسی بھی طرح کا تعصب نہیں پھلایا بل کہ ان کی تحریروں اور عملی زندگی میں انسانیت کے پرچار کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔

کئی سال تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، ماسٹر صاحب سکول میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنے رسالہ رہنمائے تعلیم کو بھی تسلسل سے شایع کرتے رہے یہاں تک رسالہ کی

منظوری دور نز دیک کے تمام سکولوں میں ہوگئی جس سے ماسٹر صاحب کے مالی حالات بہت اچھے ہو گئے۔ چند سال بعد انہوں نے لاہور شہر میں مکان تیار کر لیا اور پھر سردار کشن سنگھ سے اجازت طلب کر کے اپنے مکان میں رہائش پذیر ہو گئے۔

ماسٹر صاحب انتہائی محنت اور خلوص دل سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ وہ کبھی بھی مصائب و آلام سے نہیں گھبرائے محنت اور لگن ان کی زندگی کا خاصہ رہا۔ اس بابت شیخ محمد اسماعیل پانی پتی رقمطراز ہیں:

''۱۹۰۷ء میں جب وہ انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں لاہور آئے تھے تو انہوں نے اپنی موجودہ حالت پر قطعاً قناعت نہ کی اور مسلسل کوشش اور لگاتار محنت سے اپنی حالت کو بہتر بنانے کی سعی کرتے رہے۔ انہوں نے پوری مستقل مزاجی کے ساتھ ہر پیش آنے والی مصیبت کا مقابلہ کیا۔ نہ محنت سے گھبرائے اور نہ کوشش سے منہ موڑا۔ کفایت شعاری کو اپنا دستور العمل بنایا، کبھی جا کر تھیٹر، سرکس اور سینما کی شکل نہ دیکھی۔ اپنے ملنے والوں سے ہمیشہ انتہائی خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، جو شریف آدمی ایک مرتبہ ان سے ملا وہ ہمیشہ کے لیے ان گرویدہ ہو گیا۔ اگر اپنی رقم کسی کے پاس ہوئی تو کبھی تقاضہ نہیں کیا۔ خود اس امر کی انتہائی احتیاط رکھی کہ کسی کی کوئی کوڑی اپنے ذمہ باقی نہ رہے۔ دیانتداری اور ایمانداری کو اپنا شعار بنایا اور بے ایمانی اور داغا بازی سے ہمیشہ نفرت کی۔ تعصب عدم رواداری اور بیجا طرفداری سے ہمیشہ سے اعتراز کیا۔ جس سے جو تعلق قائم ہو گیا اسے آخر تک نبھانے کی انتہائی کوشش کی اور اس کے خلاف کسی کی کوئی بات نہیں مانی۔ ان کے رسالے کو ایک مسلمان کاتب لکھا کرتا تھا۔ جب رسالہ کو آہستہ آہستہ عروج اور ترقی حاصل ہوئی اور وہ کافی حجم کے ساتھ نکلنے لگا تو لوگوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور ایک ایڈیٹر صاحب ایک ہندو کاتب کو لے کر ان کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ سردار

صاحب آپ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی ایک مسلمان کاتب کو دیا کرتے ہیں جو اچھی بات نہیں اور وہ کاتب بھی بہت معمولی ہے۔ میں ان کاتب صاحب کو آپ کے پاس لایا ہوں یہ آپ کے ہندو بھائی ہیں اور آپ کے مسلمان کاتب سے بہت خوش خط بھی۔ اور آپ سے اس مسلمان کی نسبت کم پیسے لیں گے۔ آپ اپنے رسالہ کی کتابت کے لیے ان کو مقرر کر لیں۔ ماسٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ایڈیٹر صاحب آپ کی تشریف آوری اور کاتب صاحب آپ کی تکلیف فرمائی کا نہایت شکریہ، میں ممنون ہوں کہ آپ کو میرے فائدے اور کفایت کا خیال ہے اور آپ نسبتاً کم اُجرت پر کام کرنے کے لیے تیار ہیں مگر میری مجبوری یہ آ گئی ہے کہ میں نے ان صاحب کو پہلے سے مقرر کیا ہوا ہے اور وہ باقاعدگی اور خاموشی سے میرا کام کر رہے ہیں۔ اور مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اس حالت میں بلاقصور میں اسے کس طرح الگ کر دوں۔ یہ میں اس لیے نہیں کہتا کہ وہ مسلمان ہے اور میں اس کی طرفداری کر رہا ہوں۔ کاتب صاحب آپ یقین مانے کہ اگر آپ اس مسلمان کی جگہ کام کر رہے ہوتے اور ایک سکھ کاتب میرے پاس کام کے لیے آتا تو اس کو بھی یہی جواب دیتا جو آپ کو دے رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس معاملہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ کورا جواب سن ایڈیٹر صاحب اور کاتب خاموش ہو کر چلے گئے۔۔۔ غرض یہ اوصاف حمیدہ اور فضائل پسندیدہ تھے جن کی بدولت ماسٹر صاحب نے آہستہ آہستہ ترقی کرنی شروع کی اور آخر کار ایک زبردست ادارہ، ایک عظیم الشان دفتر اور کثیر الاشاعت رسالہ کے مالک بن گئے اور نہایت آرام وسکون اور چین کی زندگی گزارنے لگے۔۔۔ ابتدا میں جب وہ پہلے پہل لاہور آئے تو کوئی ایک آدمی بھی ان کا واقف نہ تھا مگر کچھ ہی عرصہ بعد اسی شہر میں سینکڑوں نہیں ہزاروں ان کے واقف پیدا ہو گئے اور اب تک لوگ ان کو یاد کرتے ہیں اور ان کے حسنِ سلوک خوش اخلاقی ملنساری، محبت اور بے تعصبی کے مداح ہیں۔'' ۳

ماسٹر صاحب تعلیمی فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ انتہائی مستقل مزاجی سے اپنے رسالہ کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ دن رات کی محنت اور لگن سے انہوں نے صحافتی میدان میں خاطرخواہ کامیابی حاصل کی اور دن بہ ترقی کی منازل طے کرتے چلے گئے۔

ایک وقت تھا کہ وہ جب وہ اپنے آبائی گاؤں پنڈی گھیب سے بہ سلسلہ روزگار گھر سے لاہور کے لیے نکلے تو ان کے حالات انتہائی خراب اور قابل رحم تھے۔لیکن سخت محنت کی بدولت انہوں نے چند سالوں میں لاہور کے ایک علاقے میں زمین خرید لی اور پھر کچھ ہی عرصہ میں اس زمین پر چار منزلہ عمارت کھڑی کر دی۔ رام گلی لاہور کے اس چار منزلہ مکان میں نہ صرف وہ رہائش پذیر ہوئے بل کہ انہوں رہنمائے تعلیم کا خوبصورت دفتر قائم کیا اور ساتھ ہی ایک کتب خانہ بنالیا۔

ماسٹر صاحب اعلیٰ ذوق رکھنے والے نفیس انسان تھے دفتر اور گھر کی آرائش کے لیے ہزاروں روپے کا قیمتی فرنیچر خریدہ اور جدید طرز پر گھر کی تزین و آرائش کی۔ بعدازاں کتب خانہ اور دفتر سے محلقہ ایک ذاتی ہیڈ پریس بھی لگا لیا۔جس میں اپنے رسالہ کی اشاعت کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی کتب چھپنے لگیں جس کی آمدنی سے ماسٹر جگت سنگھ نے بے پناہ ترقی کی اور بہت آرام اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کے اچھے اخلاق اور اور وضع داری کے سبب ان کے آستانہ پر شعرا و ادباء اور رسالہ کے مدیران کا آنا جانے لگا رہتا تھا اسی غرض سے انہوں نے اپنے مکان کے چند کمرے مہمان خانے کے لیے مختص کر رکھے تھے۔اس بابت حضرت جوش ملسیانی رقطراز ہیں:

''فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت اصحاب کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو ماسٹر صاحب کا نام اس فہرست میں نمایاں مقام پر نظر آئے گا۔ وہ انسانیت اور اخلاقِ حمیدہ کا مجسمہ تھے ۔وہ احباب کے دکھ سکھ میں ہمیشہ شامل رہتے تھے۔ میرے ساتھ بھی ان کے تعلقات

رسالہ کے کاروبار کے علاوہ بہت ہی مخلصانہ رہے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۴۰ میں جب زینے سے گر گیا تو لاہور سے چل کر بیمار پرسی کے لیے میرے پاس پہنچے۔ صحافتی دورہ کے سلسلہ میں بھی وہ سال میں ایک بار ضرور میرے غریب خانے پر تشریف لاتے تھے۔ طبعیت نفاست پسند تھی، ایک دفعہ کہنے لگے کہ آپ کے مکان میں جس چیز کو دیکھتا ہوں پرانی وضع کی نظر آتی ہے۔ میں نے کہا میں بھی تو پرانا ہوں ۔ کہنے لگے شاعری میں تو آپ نفاست پسند ہیں کوئی چیز بھی پرانی وضع کی نہیں لکھتے ۔ یہاں ایک لطیفہ بھی قابلِ ذکر ہے ایک دفعہ میرے غریب خانے کے دروازے پر پہنچے، پنڈت جی کہہ کر آواز دی میں اوپر کی منزل میں تھا۔ میری پنج سالہ لڑکی انہیں دیکھ کر اطلاع دینے کے لیے آئی میرے پاس پہنچی اور کہنے لگی، ایک باوا آیا ہے۔ میں نے ہنس کر ان سے ذکر کیا بہت خوش وقت ہوئے۔ لڑکی کو ایک روپیہ انعام بھی دیا اور اس تشبیہ کی داد بھی دی ۔۔۔ رواداری ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کثیر الاحباب تھے۔ ہر مذہب اور ہر عقیدے کا احترام کرتے تھے۔ بیشتر اہلِ قلم ان کی ملاقات کے لیے آتے اور ان سے مل کر مسرور ہوتے تھے۔ میں بھی جب لاہور جاتا تھا تو زیادہ تر انہی کے دولت کدہ پر ٹھہرتا تھا ۔۔۔ نچلی منزل میں ان کی وسیع نشت گاہ اہل قلم اور اہلِ ادب کی آمد سے زینت پاتی رہتی تھی۔ حضرت نوح کی آمد پر اس معزز مہمان کے اعزاز میں شعرائے لاہور کا ایک مشاعرہ بھی اسی جگہ منعقد ہوا تھا۔ اس میں حضرت سالک، حضرت حفیظ جالندھری، پروفیسر تبسم اور مشہور ادیب شیخ سر عبدالقادر بھی زینتِ محفل تھے۔'' ۴

ماسٹر صاحب صیح معنوں میں اردو کے خدمت گار اور معلم تھے اور اپنی تمام عمر طلباء کی تعلیم و تربیت میں بہتری کے لیے عملی اقدام اٹھائے۔ انہوں نے رہنمائے تعلیم کے ذریعے تعلیمی موضوعات پر گراں قدر تحقیقی، علمی اور اخلاقی مضامین کو اپنے رسالے کے صفحات کی

زینت بنایا اور اس سلسلہ میں ایسے تعلیمی مضامین شائع کیے جو نئی نسل کے لیے نہایت کار آمد تھے۔

ماسٹر صاحب کے 'رہنمائے تعلیم' کا نام محض نام نہیں تھا انہوں نے اس نام کا صیح معنوں میں حق ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ رہنمائے تعلیم کے اکثر شماروں میں ہمیں اس نوع کی تحریریں نظر آتی ہیں جن میں تعلیم ہی موضوع باعث رہا ہو۔ آگے چل کر ہمیں یہ بھی دیکھنے میں ملتا ہے کہ کئی سو صفحات کے 'تعلیم جدید' تعلیمی کانفرس' اور 'ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس' ایسے ضخیم نمبر ماسٹر صاحب کی شخصیت اور رہنمائے تعلیم کا خاصا ہے۔ سکولوں کے اساتذہ کے لیے بھی ایسے مضامین لکھے جن سے انہیں جدید طریقہء تعلیم سے روشناس کرایا۔ ان کے فرائض منصبی سے متعلق صیح معنوں میں آگاہی فراہم کی اور ان کے جائز حقوق کی حفاظت اور ان کے مسائل اور شکایات کو محکمہ کے افسران تک پہنچایا۔ غرض نہ صرف اساتذہ کو انسانیت کی خدمت کا درس دیا بل کہ تعلیمی میدان میں بھی انہیں اپنے طلباء پر توجہ اور احساسِ ذمہ داری کی ترغیب دی۔ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت سے پیش آتے تھے اور ان کی مشکلات اور تعلیمی معاملات میں آسانی پیدا فرماتے۔ ان کے ایک شاگرد 'شاعر غلام دستگیر نامی' کے فرزند ابوبکر ہاشمی رقمطراز ہیں:

''ماسٹر صاحب میرے ماڈل سکول کے اساتذہ میں سے تھے اور سائنس کی طالب علمی سے قبل میں نے اردو فارسی کی تعلیم زیادہ انہی سے حاصل کی، ماسٹر جی لاہور کی زندگی میں بالعموم اور ماڈل سکول کی تاریخ میں بالخصوص ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ ان کا رسالہ 'رہنمائے تعلیم' ماڈل سکول میگزین کی اشاعت سے قبل ماڈل سکول لاہور کا خاص پرچہ تھا۔ سکول میں طلباء کو داخل کرنے میں ان کا خاص ہاتھ ہوتا تھا اور داخلہ کے وقت سے ہر طالب علم اور اس کا سرپرست ماسٹر صاحب کی دوست نواز شخصیت سے اچھی طرح واقف

ہو جاتا تھا۔ گو سردار صاحب کی مصروفیت ان کے کے رسالے کی اشاعت و ترسیل کی وجہ کافی ہوتی تھیں۔ مگر جماعت میں انہوں نے ہمیشہ پوری توجہ سے طالب علموں کو پڑھایا اور تنخواہ کو حلال کر کے کھایا اور ان کا طریقہ تعلیم نہایت سادہ مگر موثر تھا۔ طالب علم نہایت دل جمعی سے پڑھتے۔ مجھے کہا کرتے تھے نامی باپ کے بیٹے کو گمنامی کی زندگی بسر نہیں کرنی چاہئے، تم بھی کوشش کرو اور نامی بنو۔ مگر بچپنے کی وجہ سے ہم ان کی ان مہربانیوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ چونکہ میرے والد محترم غلام دستگیر نامی سے ان کے خاص مراسم تھے اس لیے میرے پر ان کی نوازشات کچھ زیادہ ہی تھیں۔ اباجی جب بھی میرے روبرو ان سے ملتے، ان سے میری شکایت ان الفاظ میں کرتے '' نامی صاحب میں تو اس برخوردار کی پڑھائی سے بہت پریشان ہوں۔ ایک ادیب کا بیٹا ہو کر نہ جانے پڑھائی سے ایسی لاپروائی کیوں برت رہا ہے۔ میں ان کی باتیں سن کر بڑا حیران ہوتا کیوں کہ ان کے خاص مضامین اردو فارسی میں، میں اپنے دوسرے ہم جماعتوں سے کسی طرح پیچھے نہ تھا۔ مگر اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہ ان کا پڑھائی کی طرف مبذول رکھنے کا ایک حربہ تھا اور وہ تہ دل سے میری بھلائی چاہتے تھے۔ میں سکول سے کالج میں لایا گیا تو غالباً ریٹائر ہو چکے تھے۔ کبھی کبھار اباجی کا کوئی مضمون دینے رام گلی میں ان کے مکان پر جاتا تو بڑے خلق سے پیش آتے اور مجھے بھی مضمون نگار بننے کی تلقین کرتے۔۔۔ تقسیم ملک کے بعد ماسٹر جی دہلی چلے گئے مگر ان کا دل لاہور میں ہی رہا۔ لاہور اور لاہور والوں کو انہوں نے بالکل فراموش نہیں کیا۔ ایک بار اباجی سے ان کی ملاقات ہوئی گلے مل کر بچوں کی طرح روئے کہ گھگھی بندھ گئی۔ بہت مہربان استاد، بڑے مخلص دوست اور بہت پُردرد انسان تھے۔'' ۵

ماسٹر صاحب بھرپور تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۳۸ء میں اپنی ملازمت کی سبکدوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تمام تر توجہ رسالہ پر مرکوز رہی۔ تقسیم ہند پر لاہور سے

دہلی منتقل ہو گئے جہاں ۲۶ دسمبر ۱۹۶۲ء میں آنجہانی ہوئے۔ان کی وفات کے بعد اپنے ایک پیغام میں عرش ملسیانی رقمطراز ہیں:

"۲۶ دسمبر ۱۹۶۲ء کو سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے دلّی میں انتقال ہو گیا۔مرحوم کی تعلیمی اور علمی خدمات کا سلسلہ بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔۵۷ سال آپ رسالہ رہنمائے تعلیم کی پرورش کرتے رہے۔یہ رسالہ کہنے کو تو تعلیمی تھا لیکن ایک زمانے میں اس کی ادبی اور ثقافتی حیثیت ایسی تھی کہ اس پایے کے رسالے ملک میں کم تھے۔ڈاکٹر اقبال، منشی پریم چند، غلام بھیک نیرنگ ،فصاحت جنگ جلیل، حسرت موہانی ایسے باکمال اس رسالے میں تو تر سے لکھتے تھے۔۱۹۳۰ میں جوبلی نمبر شایع ہوا تو صحافتی دنیا میں ایک انقلاب رونما ہوا۔اس کے بعد فسانہ نمبر، ریڈ کراس نمبر اور نا جانے کتنے نمبر شائع ہوئے۔۱۹۳۸ء میں ریڈ کراس نمبر شائع ہونے پر حکومتِ وقت نے انہیں سردار صاحب کے خطاب سے نوازا۔اس زمانے میں ایسے خطاب وطن دشمن سرکاری مہروں کو دیئے جاتے تھے لیکن ماسٹر صاحب کو یہ خطاب خالص ان کی ادبی خدمات کے صلہ میں ملا۔مرحوم بڑے صلح کل، ملنسار اور نیک انسان تھے۔اتنی طویل مدت تک علمی خدمت کرنا انھیں کا کام تھا۔تقسیم ملک کے بعد جب وہ بے گھر ہو کر دلّی آئے تو مفتی والا اس میں مقیم ہوئے۔مالی حالت اچھی نہ تھی۔راقم اور ان کے کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ رہنمائے تعلیم کو بند کر دیا جائے۔مگر وہ دھن کے پکے تھے، نہ مانے۔ان کے ارادوں اور عمل کی اس استقامت کی جتنی داد دی جائے کم ہے اردو صحافت اور نیک انسانوں کی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پُر ہونا بہت مشکل ہے۔"[۶]

ماسٹر صاحب کی اولاد میں چھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔حلقہء احباب بہت وسیع تھا تاہم ان کے چند قریبی دوستوں میں داغ دہلوی کے شاگرد اور جانشین حضرت نوح

ناروی، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، جوش ملسیانی، شیخ عبدالقادر، ابر احسنی، رتن پنڈوردی، امر ناتھ طپش، مبشر علی صدیقی، گوپی ناتھ امن لکھنوی، فضا جالندھری اور عرش ملسیانی شامل تھے۔

حوالہ جات:

۱۔ محمد طفیل، نقوش (آپ بیتی نمبر شمارہ ۲) ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۴۵۶
۲۔ محمد طفیل، نقوش (آپ بیتی نمبر شمارہ ۲) ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۴۵۷
۳۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، رہنمائے تعلیم (مدیر حصہ نثر) جلد ۵۹، شمارہ ۲، ۳، فروری مارچ ۱۹۶۴ء دہلی ص ۳۰، ۳۱
۴۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، رہنمائے تعلیم (مدیر حصہ نثر) جلد ۵۹، شمارہ ۲، ۳، فروری مارچ ۱۹۶۴ء دہلی ص ۴۰
۵۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، رہنمائے تعلیم (مدیر حصہ نثر) جلد ۵۹، شمارہ ۲، ۳، فروری مارچ ۱۹۶۴ء دہلی ص ۱۳۳
۶۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، رہنمائے تعلیم (مدیر حصہ نثر) جلد ۵۹، شمارہ ۲، ۳، فروری مارچ ۱۹۶۴ء دہلی ص ۱۴۳

دیگر ماخذ:

نند کشور وکرم، عالمی اردو ادب (اشاریہ) دہلی ۲۰۱۲ء
ہر بھجن سنگھ تھاپر، رہنمائے تعلیم (صدی نمبر) نومبر ۲۰۰۵ء دہلی
امام مرتضیٰ نقوی، اردو ادب میں سکھوں کا حصہ، امروہہ اتر پردیش، ۱۹۷۰

امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد چہارم، صابری اکیڈمی چوڑی والان دہلی ۱۹۷۴ء

جوش ملسیانی، مدیر، رہنمائے تعلیم، جلد ۱۴، شمارہ ۱۲، لاہور، دسمبر ۱۹۴۶ء

سید منصور آغا، قومی آواز، دہلی ۲۰۱۴ء

محمد یحییٰ دہلوی، ایشاء ٹائمز، رام لیلا میدان ترکمان گیٹ دہلی ۲۰۱۴ء

سید نصرت بخاری

ایک اور کتاب کی چوری

مجلس نوادراتِ علمیہ اٹک ؛جس کے روح ورواں نذر صابری مرحوم تھے ؛کو اول روز سے ضلع اٹک میں نوادراتِ علمیہ کی جستجو رہی ہے۔اسی کوشش میں مجلس نے ۱۹۶۳ء میں گاؤں ملاں منصور، ضلع اٹک میں حضرت جی بابا کے خاندانی کتب خانے سے دوسوسال پرانا ایک قلمی نسخہ دریافت کیا۔یہ ایک شعری دیوان تھا جو مجلس کے توسط سے پہلی بار منظرِ عام پر آرہا تھا؛شاعر کا نام "شاکر" تھا۔

''ایک اندازے کے مطابق شاکر اٹکی کا زمانہ عالمگیر کی وفات ۱۱۱۸ کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے۔وہ سرزمینِ پنجاب کے ایک مشہور بزرگ شیخ یحییٰ المعروف بہ حضرت جی بابا اٹکی (م ۱۱۳۲ھ) کا پوتا ہے(۱)۔

اس دیوان کو ضلع کونسل کی مالی اعانت سے مجلس نے ۱۹۷۰ء میں پہلی بار ''دیوانِ شاکر'' کے نام سے ملٹری پریس کیمبل پور سے شائع کر دیا۔سرورق پر ''دیوانِ شاکر'' کے عین اوپر مجلس نوادراتِ علمیہ کا مونوگرام بنا ہوا ہے؛جس میں ''مجلس نوادراتِ علمیہ اٹک'' صاف پڑھا جاتا ہے۔ ۱۴۸ صفحات (۲) پر مشتمل اس دیوان کے مرتب نذر صابری اور سید رفیق بخاری ہیں۔دیوان میں فارسی میں قصائد،قطعات،نوحہ اور دیگر منظومات کے علاوہ ۱۰۸ غزلیں بھی ہیں۔تین غزلیں اردو میں بھی ہیں۔اس کے علاوہ اردو میں لکھا ہوا ایک دوہا بھی ہے۔اس طرح اب تک کی تحقیق کے مطابق شاکر اٹکی ضلع اٹک کے نہ صرف پہلے اردو ،فارسی غزل کے شاعر ہیں بلکہ اٹک کے پہلے دوہا نگار بھی ہوئے۔تین صفحات پر مشتمل مقدمہ نذر صابری کا لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے فارسی غزلوں کی تعداد ۷۶ بتائی ہے؛اور مقدمے میں ہی مرزا محمد نصیر بیگ جو اس وقت بی ایس سی کے طالبِ علم تھے، کی

وساطت سے حضرت جی بابا کے تمام خاندان کا دو سو سال تک اس قلمی نسخے کو محفوظ رکھنے پر شکریہ ادا کیا ہے۔ ''شرحِ احوال'' کے عنوان سے پروفیسر سعداللہ کلیم نے بھی تین صفحات لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ سعداللہ کلیم صاحب نے آخر میں اردو کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ ''اسلوب وافکار'' کا نام دے کر سید رفیق بخاری نے کلام کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے؛ جو چار صفحات کو محیط ہے۔ اس دیوان کی اشاعت نے اردو ادب کے نام ور محققین کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں اس کتاب کا ذکر یوں کیا ہے:

''بارھویں صدی ہجری میں شاکر نامی ایک شاعر اٹک (ضلع کیمبل پور) میں داد سخن دے رہا ہے۔ وہ بنیادی طور پر فارسی کا شاعر ہے لیکن اس کے دیوان میں تین غزلیں اور ایک دوہا اردو زبان میں بھی ملتا ہے''۔ (۳)

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

"مجلس نوادراتِ علمیہ اٹک نے "دیوان شاکر" کی اشاعت کا اہتمام کر کے محققین کے لیے تحقیق کے ایک اور میدان کی نشان دہی کی ہے اور یہ مفروضہ غلط ثابت کر دیا ہے کہ شمالی ہند میں ولی دکنی کے کلام کی رسائی کے بعد اردو (یا ہندوی) شاعری کی ابتدا ہوئی''۔ (۴)

ڈاکٹر سلیم اختر بغیر حوالہ دیے نذر صابری اور ڈاکٹر سعداللہ کلیم کی آرا سے استفادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اٹک میں ایک اور صوفی شاعر شاکر بھی ملتے ہیں جو عربی اور فارسی کے ساتھ ہندوی میں بھی شاعری کر رہے تھے''۔ (۵)

خورشید احمد خان یوسفی نے ''پنجاب کے قدیم اردو شعرا'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ ان قدیم شعرا میں انھوں نے شاکر اٹکی کو بھی شامل کیا ہے؛ حوالہ درج کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

دیوانِ شاکر اٹکی، مرتبہ نذر صابری و سید رفیق بخاری، مجلس نوادراتِ علمیہ اٹک، ۱۹۷۰۔
اس مضمون کا تمام مواد اسی کتاب [دیوانِ شاکر] سے لیا گیا ہے"(۶)۔

دیوانِ شاکر کی پہلی اشاعت تقریباً کم یاب ہو چکی تھی کہ اچانک ۲۰۱۰ء میں ۱۹۸ صفحات پر مشتمل دیوانِ شاکر کی دوسری اشاعت منظرِ عام پر آئی جس نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی۔ اس دوسری اشاعت کے ذمہ دار ڈاکٹر صاحبزادہ نصیر احمد خان ہیں۔ یہ وہی مرزا نصیر احمد ہیں جن کی اشاعت اول کے دیباچے میں نذر صابری صاحب نے شکریہ ادا کیا ہے۔ "ڈاکٹر صاحبزادہ نصیر احمد خان؛ تحصیل حضرو، ضلع اٹک کے ایک گاؤں ملا منصور کے رہنے والے ہیں۔ آپ قائدِ اعظم یونیورسٹی کے شعبہ ایڈمنسٹریٹو سائنسز کے چیئر مین رہے ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں یونیورسٹی سے ریٹائرڈ ہوئے اور پھر Comsats اٹک سے وابستہ رہے"(۷)۔ صاحبزادہ صاحب نے تمام ادبی تقاضوں اور دیانت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دیوانِ شاکر پر نذر صابری، رفیق بخاری کے اسما اور مجلس نوادرات علمیہ کا مونو گرام مٹا دیا اور اس دوسری اشاعت پر بطور مدون اپنا نام لکھ کر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ گویا یہ اُن کا ذاتی کارنامہ ہے۔ دوسری اشاعت کے سرورق کی ترتیب یوں ہے:

دیوانِ شاکر

مصنف

عبدالشکور شاکر

تدوین

ڈاکٹر صاحبزادہ نصیر احمد خان

اور تو اور انھوں نے بڑی دیدہ دلیری سے دیوانِ شاکر کی پہلی اشاعت پر نذر صابری ہی کے لکھے ہوئے مقدمے پر اپنا نام چسپاں کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ گویا یہ ان کی

(صاحبزادہ صاحب کی) تحریر ہے۔ البتہ آخری پیراگراف میں چند جملوں میں ردوبدل کر کے اپنا حصہ بھی ڈالا ہے۔ نمونے کے لیے پہلی اشاعت اور دوسری اشاعت کے مقدمے کی آخری سطور درج کرتا ہوں تاکہ واضح ہو جائے کہ موصوف نے کہاں کہاں اور کس طرح پیوند کاری کی۔ نذر صابری صاحب لکھتے ہیں:

''آخر میں ہم مرزا محمد نصیر بیگ بی ایس سی کی وساطت سے حضرت جی بابا کے تمام افرادِ خاندان کے سپاس گزار ہیں کہ انھوں نے دوسو سال تک اس گوہرِ یکتا کو محفوظ رکھ کر قدر شناسی کا حق ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق مدظلہ کے بھی ممنون ہیں کہ ان کی فکرِ گرہ کُشا نے متن کی بعض الجھنوں کو سلجھانے میں ہماری بہت مدد کی۔ ڈسٹرکٹ کونسل [اٹک] بھی ہمارے شکریے کی مستحق ہے جس کی مالی امداد سے یہ دیوان منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا ہے''(۸)۔

نصیر احمد خان لکھتے ہیں: ''آخر میں مجھے ان تمام اصحاب کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی وساطت سے یہ نسخہ منصہ شہود پر آیا۔ ان میں خصوصی طور پر میں اپنے استاد محترم جناب سعد اللہ کلیم صاحب مرحوم کا اور نذر صابری صاحب کا مشکور ہوں جنھوں نے اس نسخہ کو پہلی بار نوادراتِ علمیہ اٹک کی نمائش میں پیش کیا۔ مختلف صفحات پر ذیلی حاشیے بھی جناب نذر صابری صاحب نے تحریر کیے ہیں۔ میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب مرحوم کا بھی ممنون ہوں کہ اُن کی فکرِ گرہ کشا نے متن کی بعض الجھنوں کو سلجھانے میں ہماری مدد کی۔ میں اپنے برادرِ محترم جناب نثار احمد خان اور برادرِ خورد [خرد] صاحبزادہ توشیر احمد خان کا بھی مشکور [شکر گزار] ہوں کہ انھوں نے اس نسخے میں دلچسپی لی اور جناب عبدالشکور شاکر کے مزار کی تزین نو کا فیصلہ کیا''(۹)۔

"دیوانِ شاکر" شاکر کے دوسرے ایڈیشن میں صاحبزادہ صاحب کا حصہ چند جملے ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف کی کسی قسم کی کوئی شرکت نہیں۔ انھوں نے بنے بنائے تاج محل پر اپنے نام کی تختی لگا تو دی ہے لیکن اس طرح وہ اس تاج محل کے مالک نہیں بن سکیں گے۔

حوالہ جات:

(۱) نذر صابری، مقدمہ، دیوانِ شاکر، مجلس نوادرات علمیہ اٹک، ۱۹۷۰ء

(۲) دیوان پر ۱۳۶ صفحات درج ہیں کیونکہ مرتب نے اپنی، سعداللہ کلیم صاحب اور رفیق بخاری صاحب کی آرا پر ہندسوں کی بجائے حروف لکھے ہیں۔

(۳) تاریخِ ادب اردو، جلد اول، ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب لاہور، جولائی ۱۹۷۵ء، ص ۶۶۵

(۴) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مقالات، گل بکاؤلی نشتر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۲

(۵) ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (سولہواں ایڈیشن)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۷۸

(۶) پنجاب کے قدیم شعرا، خورشید احمد خان یوسفی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

(۷) ڈاکٹر صاحبزادہ نصیر احمد خان، دیوانِ شاکر، اشاعت دوم، ناشر ندارد، ۲۰۱۰ء، پس ورق

(۸) نذر صابری، مقدمہ، دیوانِ شاکر، مجلس نوادرات علمیہ اٹک، ۱۹۷۰ء

(۹) دیوانِ شاکر (جعلی ایڈیشن)، صاحبزادہ نصیر احمد خان، اشاعت دوم، مقدمہ

پروفیسر شوکت محمود شوکتؔ

خانقاۂ مولانا محمد علی مکھڈی: ایک تعارف

برصغیر پاک و ہند میں اردو زبان وادب کے ارتقا میں صوفیائے کرام کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ اردو ادب کی ابتدائی کتب/ رسائل انھی صوفیائے کرام کی تحریر کردہ ہیں۔ یہ صوفیائے کرام پورے برصغیر پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں بیٹھ کر اردو زبان وادب کی خدمت (دانستہ/ نادانستہ) کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ ان صوفیائے کرام نے اپنی خانقاہوں میں جہاں درس و تدریس کا کام کیا وہاں اردو زبان وادب کی ترویج کے لیے انھوں نے مساعیٔ جمیلہ بھی کیں۔ اس طرح ان خانقاہوں کا اردو زبان وادب کے حوالے سے کردار اور ان کی مساعیٔ جمیلہ نہ صرف قابل تحسین و آفرین ہیں بلکہ نا قابل فراموش بھی ہیں۔ ان صوفیائے کرام نے رشد و ہدایت کے لیے جب اس مقامی زبان (اردو) کو اپنا وسیلہ بنایا تو تبلیغِ دین کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کے خدمت بھی بالواسطہ طور پر کرتے گئے ۔اس طرح وہ تبلیغِ اسلام اور اخلاقی پرچار کے ساتھ اردو ادب کی تخلیق بھی کرتے گئے ۔اس ضمن میں کئی صوفیائے کرام کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ تاہم، حضرت سید حسینی بندہ نواز گیسو دراز کے جن کی معروف ترین تصنیف ''معراج العاشقین'' ہے، میراں جی شمس العشاق کی جن کی مشہور تصانیف ''خوش نامہ''، ''ارشاد نامہ'' اور ''شہادت الحقیقت'' ہیں، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ جیون، شاہ برہان الدین جانم، سید اکبر حسینی، صدرالدین چشتی، عبداللہ حسینی، شیخ حمید الدین ناگوری، حضرت بوعلی قلندر، امیر خسرو، شیخ سراج الدین عثمان، سید محمد جونپوری، قطب عالم، شاہ عالم، شیخ وجیہہ الدین، وغیرہ کے

اسمائے گرامی زیادہ معروف و مشہور ہیں۔ مذکورہ صوفیائے کرام کا، اردو زبان و ادب کے حوالے سے علمی و ادبی کام پورے برصغیر پاک و ہند پر پھیلا ہوا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب ''تاریخ ادبِ اردو'' میں یوں رقم طراز ہیں:۔

''یہ صوفیائے کرام برعظیم کے مختلف علاقوں میں رشد و ہدایت کی روشنی پھیلا رہے ہیں، بابا فرید گنج شکر، ملتان کے رہنے والے ہیں، شیخ حمید الدین ناگوری وسطِ ہند کے، بوعلی قلندر، پنجاب و ہریانہ کے، شیخ شرف الدین یحیٰی، بہار و بنگال کے امیر خسرو دہلی کے اور شیخ عبدالقدوس گنگوی، اودھ کے، جو پنجاب میں تھا"۔

اسی طرح، صوبہ پنجاب کے ضلع اٹک کے جنوب مغرب میں واقع قصبے مکھڈ شریف میں، گورداس پور کے ایک گاؤں بٹالہ سے تقریباً اڑھائی سو سال قبل، ۲۵ سال کی عمر میں ایک صوفی، مولانا محمد علی مکھڈی تشریف لائے۔ انھوں نے مذکورہ قصبے میں ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی جسے دنیا آج خانقاہ مولانا محمد علی مکھڈی کے نام سے جانتی ہے۔ اس خانقاہ کی علمی و ادبی خدمات تقریباً اڑھائی صدیوں پر محیط ہیں۔ یہاں سے کئی جید علما فارغ التحصیل ہوئے جن کی کئی تخلیقات و تالیفات منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکی ہیں نیز اس خانقاہ کے صوفیائے کرام اور علمائے کرام کی اپنی ذاتی علمی و ادبی تخلیقات بھی موجود ہیں۔

اس خانقاہ میں دو کمروں پر مشتمل ایک قدیم دارالکتب بھی ہے، جس کے ایک کمرے میں عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں لکھے گئے مخطوطات موجود ہیں۔ جب کہ دوسرے کمرے میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے وقیع کتب اور علمی اور ادبی رسائل کا سرمایہ موجود ہے۔ دارالکتب کے دوسرے کمرے میں، دو گوشے بھی قائم کیے گئے ہیں جن میں سے ایک گوشہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز ساحرؔ، صدرِ شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی ،اسلام آباد اور دوسرا گوشہ پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ، استاد شعبۂ اردو علامہ اقبال اوپن

یونی ورسٹی، اسلام آباد کے نام سے موسوم ہے۔

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اس دارالکتب میں موجود پنجابی مخطوطات کی فہرست کو بڑی محنت اور عرق ریزی سے کتابی صورت میں ''خانقاہ مولانا محمد علی مکھڈی کے پنجابی خطی نسخے'' کے نام سے مرتب کیا ہے جب کہ اس دارالکتب میں موجود اردو علمی و ادبی کتب کی توضیحی فہرست (مطبوعہ قبل اگست ۱۹۴۷ ع) کے عنوان سے ناردرن یونیورسٹی نوشہرہ سے ایم فل (اردو) کا مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ یہ ایم فل (اردو) کا مقالہ، مولانا محمد علی مکھڈی کے کتب خانے میں اردو علمی و ادبی کتب کا توضیحی اشاریہ ہے جن کی تعداد ۳۴۰ ہے۔ اس کے علاوہ، ملہوالی، تحصیل پنڈی گھیب سے تعلق رکھنے والے نوجوان محقق محمد سلیم علوی، مذکورہ دارالکتب میں موجود عربی مخطوطات کی فہرست سازی کر رہے ہیں۔

اس خانقاہ میں موجود یہ دارالکتب، نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی محققین کا محور و مرکز ہے۔ دور دور سے علما اور محققین اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ آج کل، اس خانقاہ کے گدی نشین جناب فتح الدین ہیں جو خود ایک جید عالم، دانش ور اور کتاب دوست ہیں جب کہ ان کے بیٹے ڈاکٹر محمد ساجد نظامی بھی پی ایچ۔ ڈی (اردو) ہیں جو اس خانقاہ سے ایک ششماہی رسالے ''قندیلِ سلیماں'' کا اجرا بھی تقریباً پانچ سال قبل کر چکے ہیں۔ یہ شمارہ پہلے سہ ماہی تھا اب ششماہی ہو گیا ہے اور اس کے اب تک اٹھارہ شمارے شایع ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مکھڈ شریف جیسے دور افتادہ علاقے میں یہ خانقاہ اور اس کا کتب خانہ کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں، اللہ تعالیٰ، ان میں مزید خیر و برکت عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆☆☆

محمد عزیر عاصم

علاقہ چھچھ کے ذاتی کتب خانے

علاقہ چھچھ علمی دنیا میں بخارا اور سمرقند کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کی شہرت کی بنیادی وجہ یہاں کی علمی خصوصاً دینی فضا اور نامور علمی شخصیات کا وجود ہے۔چھچھ کے اس علمی پس منظر میں جہاں شخصیات قابلِ ذکر ہیں۔وہاں ادارے خاص طور پہ کتب خانے بھی اپنے بھرپور کردار کے ساتھ معروف ہیں۔چھچھ کے ذاتی کتب خانوں میں حضرو کی نامور علمی شخصیت خواجہ محمد خان اسدؒ کا قائم کردہ کتب خانہ ادبی دنیا میں خصوصی شہرت رکھتا ہے۔اس کتب خانہ کا باقاعدہ آغاز ۱۹۲۳ء میں حضرو شہر کے محلہ عظیم خان میں ہوا۔اس کے علاوہ کچھ مدارس اور خانقاہوں میں قائم کتب خانوں کا ذکر ملتا ہے۔جن میں سے چند اہم کا اجمالی تعارف ذیل میں دیا جاتا ہے۔

مولانا نصیرالدین غورغشتویؒ کا کتب خانہ:

علم حدیث کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت رکھنے والے علاقہ چھچھ کے گاؤں غورغشتی کے شیخ الحدیث مولانا نصیرالدین غورغشتویؒ کے ہاں کتب کا ایک وافر ذخیرہ موجود تھا۔ان کتب میں زیادہ تر کتب مذہبی اور علمی ضرورت کی تھیں۔ان کتب سے نہ صرف طلبہ بلکہ عام آدمی بھی استفادہ کر سکتے تھے۔ان کتب میں کچھ قلمی نسخے بھی تھے۔جو ان کے مرید خاص خواجہ محمد خان اسدؒ (بانی میرا کتب خانہ حضرو) نے اٹک کالج کی نمائش میں پیش کیے۔اور معروف محقق نذر صابری نے اپنی کتاب " فہرست مخطوطات " میں شامل کیا۔جن کا حوالہ بعدازاں معروف ایرانی سکالر محمد حسین تسبیحی نے اپنی تحقیق " نسخہ ہائے خطی پاکستان " میں " کتب خانہ نصیریہ غورغشتی " کے عنوان سے کیا۔اب ان مخطوطات اور کتب کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

مولانا میاں عبدالحقؒ کا کتب خانہ:

غور غشتی ہی کے ایک اور صاحب علم بزرگ میاں عبدالحقؒ درس و تدریس اور علم و فضل کے حوالے سے شہرت کے حامل ہیں۔ انہوں نے درس و تدریس کے ساتھ خانقاہی نظام کو بھی فروغ دیا۔ ان کے ہاں بھی کتابوں کے ایک وسیع ذخیرے کی اطلاع ملتی ہے۔ مگر یہ کتب بھی دینی علوم پر ہی مشتمل تھیں۔ ان کے ہاں موجود چند مخطوطات کا ذکر بھی محمد حسین تسبیحی نے اپنی کتاب "نسخہ ہائے خطی پاکستان " میں کیا ہے۔ یہ کتب بھی اب ناپید ہیں۔

مفتی محمد عثمان شمس آبادیؒ کا کتب خانہ:

تحصیل حضرو کے ذاتی کتب خانوں میں مفتی محمد عثمان صاحب شمس آبادی کے ذاتی کتب خانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتب خانہ میں کئی نادر و نایاب اور قیمتی کتب کے نسخے موجود تھے۔ یہ ایک ذاتی اور نجی کتب خانہ تھا جس سے اہل علم استفادہ کرتے تھے۔ اس کتب خانہ کے بعض مخطوطات کا ذکر ڈاکٹر سفیر اختر نے اپنی کتاب" راولپنڈی، ضلع اٹک اور ہری پور کے کتب خانے" میں کیا ہے۔ یہ کتب خانہ بھی مرور ایام سے اب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔

میرا کتب خانہ حضرو:

خواجہ محمد خان اسدؒ کا قائم کردہ کتب خانہ بنام" میرا کتب خانہ حضرو" کے نام سے ایک معتبر شناخت کا حامل کتب خانہ کے طور پہ جانا جاتا ہے۔ یہ کتب خانہ اپنے آغاز سے اب تک مشاقانِ علوم کی سیرابی میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کتب خانہ میں سولہ ہزار کے لگ بھگ کتب ورسائل موجود ہیں۔ جو سیرت، دینیات، سوانح، تاریخ، قران و حدیث، فقہ وقانون، ادب و سیاست اور مکاتیب وخطبات جیسے اہم موضوعات پر مشتمل ہیں۔ کتب

خانہ کا ایک حصہ ڈراموں، مختصر افسانوں، تراجم، ناول اور دوسرے موضوعات کے لیے وقف ہے۔اس حصہ میں تقسیم سے قبل کے تمام معروف مصنفین کی کتب موجود ہیں۔اہم بات ہی کہ تقسیم سے قبل اور بعد کے تمام اہم رسائل کی مکمل جلدیں موجود ہیں۔

ملک اور بیرون ملک سے اکثر سکالرز ریسرچ کے لیے اس کتب خانہ میں آتے رہتے ہیں۔ان زائرین کتب کی خدمت اور مہمان نوازی کے لیے بانی کتب خانہ کے جواں ہمت فرزند معروف ادیب جناب راشد علی زئی عمدگی سے سرانجام دیتے ہیں۔ان کی محنت اور کاوش کی بدولت آج اس کتب خانہ کا شمار ملک کے چند اہم کتب خانوں میں ہوتا ہے۔

حافظ نثار احمد الحسینی کا کتب خانہ:

تحصیل حضرو کے ذاتی کتب خانوں میں ایک اہم کتب خانہ حافظ نثار احمد الحسینی کا بھی ہے۔یہ کتب خانہ ان کی خانقاہ" خانقاہ امدادیہ" میں قائم ہے۔اس کتب خانہ میں تمام علوم پر نہ صرف اہم کتب موجود ہیں بلکہ الگ الگ عنوانات سے کتابیں ترتیب سے ہیں۔ان کتب کی کمپیوٹرائزڈ فہرست بھی موجود ہے۔اس کتب خانہ کا تمام انتظام و انصرام حافظ نثار احمد خود ہی سرانجام دے رہے ہیں۔اس کتب خانہ سے استفادہ کی سہولت تمام خاص و عام کے لیے ہے۔

ملک حق نواز خان کا کتب خانہ:

تحصیل حضرو کی ایک اہم علمی شخصیت ملک حق نواز خان صاحب کی ہے۔جو ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔انہوں نے اپنا تمام وقت مطالعہ کے لیے مخصوص کیا ہوا ہے۔ان کے کتب خانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے پاس غالبیات اور اقبالیات پر کتب کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب کتب خانہ کو خود ان دونوں موضوعات سے دلچسپی ہے۔لیکن عام آدمی کی رسائی اور استفادہ کرنے کی سہولت موجود نہیں ہے۔

کتب خانہ حافظ زبیر علی زئی مرحوم:

اہل حدیث مکتبہ فکر کے نامور عالم دین حافظ زبیر علی زئی مرحوم کا ذاتی کتب خانہ بھی علاقہ چھچھ کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ان کے کتب خانہ میں بھی ہزاروں کی تعداد میں کتب موجود ہے۔اس میں زیادہ مواد دینی کتب پر مشتمل ہے۔خصوصاً کتب احادیث بے شمار ہیں۔ یہاں عام آدمی کے استفادے کی سہولت موجود ہے۔ بانی کتب خانہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔اس لیے اس کتب خانہ کی حفاظت اور بقاء کی خصوصی ضرورت ہے۔

سید کفایت بخاری کا کتب خانہ:

تحصیل حضرو کی معروف علمی وادبی شخصیت سید کفایت بخاری کا کتب خانہ بھی اس علاقہ کا ایک اہم کتب خانہ ہے۔ذاتی نوعیت کا یہ کتب خانہ بھی مختلف موضوعات پر مشتمل کتب پر مشتمل ہے۔جن میں قران وحدیث،شعر وحکمت،تاریخ وادب،سفر نامہ غرض ہر موضوع پہ بے شمار کتب موجود ہیں۔ یہ کتب خانہ بھی گھر میں قائم ہے۔عام آدمی براہ راست تو استفادہ نہیں کر سکتا مگر بخاری صاحب کے ذاتی تعلق والے آدمی ہر وقت استفادہ کر سکتے ہیں۔ممکن ہے جلد اس کتب خانہ کی توضیحاتی فہرست تیار ہو جائے اور شائقین کتب اس نادر و نایاب کتب پر مشتمل کتب خانے کی اہمیت سے واقف ہو سکیں۔

(انشائیہ) مریم ثمر

آج کیا پکایا جائے

مشرق میں عموماً خواتین کا اور مغرب میں خصوصاً حضرات کا، یہ صدیوں پُرانا مسئلہ رہا ہے کہ " آج کیا پکایا جائے"۔۔۔مگر داد دینے پڑے گی ان سب گھریلو خواتین (اور حضرات کو بھی) کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیتے ہیں۔ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہم نے اپنے میاں جی کے دفتر جانے سے قبل پوچھا، آج کیا پکاؤں؟ انہوں نے ہمارے سراپا سوالیہ نشان بنے چہرے کی طرف دیکھا اور جھنجھلا کر بولے، کتنی دفعہ کہا ہے کہ جب کام پر جانے کے لئے نکلنے لگوں، تو ایسے سوال مت کیا کرو۔۔۔جو جی میں آئے پکا لینا۔۔ (ویسے آپس کی بات ہے کہ ان کو بھی اس سوال کا جواب نہیں آتا) مگر پھر بھی ہم نے ان کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھا اور اک شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معصومانہ انداز میں پوچھا۔۔اچھا تو آج خیالی پلاؤ، تھالی کا بینگن یا یہ منہ اور مسور کی دال کیسی رہے گی۔۔؟ (واللہ! یہ کہتے ہوئے ہمارا اشارہ ہرگز ان کی طرف نہیں تھا) انہوں نے ہمیں غصیلی نظروں سے گھورا، ہم تھوڑا سہم سے گئے، مگر ڈر اور خوف ظاہر کیے بغیر کہا، اچھا ٹھیک ہے اب ٹماٹر کی طرح لال پیلے تو نہ ہوں، ہم خود ہی کچھ سوچ و بچار کر لیتے ہیں۔

بچوں کو ناشتہ دے کر اسکول بھیج دیا، کام کاج سے فارغ ہو کر گھر کے ایک کونے میں " اداس بلبل" کی طرح بیٹھ کر سوچنے لگے، کہ آخر آج پکایا کیا جائے۔۔تھوڑی ہی دیر میں ہم خوشی سے چلائے۔۔وہ مارا۔! آج مرغی پکا لیتے ہیں، سبزی کی طرح، نہ چھیلنی پڑے گی اور نہ ہی کاٹنی۔۔بازار سے آئی۔۔دھوئی۔۔اور پکنے چڑھا دی۔

اگلے دن ہم پھر اسی صورتحال سے دو چار تھے، کافی غور و خوض کے بعد میاں صاحب کے

لئے ان کی ایک پسندیدہ ڈش تیار کی (یہاں میاں صاحب سے مُراد، وہ والے خادم اعلیٰ ہرگز نہیں ہیں) خیر اُن کے آنے پر کھانا قرینے سے چُن دیا۔ بُلانے گئے تو بولے" بھئی ابھی تو بھوک نہیں ہے"۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا، دال میں کچھ کالا نظر آیا۔ روایتی بیویوں کی طرح جب تحقیق کی تو پتا چلا کہ پوری کی پوری دال ہی کالی ہے، موصوف چائینز کھا کے آ رہے تھے۔

پھر ایک دن اور آ گیا، آج تو واقعی کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ کیا پکایا جائے۔ جب کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تو اطمینان سے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ ایک سرد آہ بھری، اور پرانے وقتوں کو یاد کرنے لگے، تب کتنے مزے ہوا کرتے تھے، نہ مہنگائی کا رونا تھا نہ کھانا پکانے کی فکر۔ جب بھوک لگی سامنے درخت سے دو، چار پتے توڑے اور کھا لیے۔ کسی دن عیاشی کرنے کو دل کیا تو ہمسائے کی دیوار پھاندی اور املی کے دو چار پتے اُڑا لیے۔ بالوں اور چہرے کی خوبصورتی کو چار چاند لگانے کا خیال آیا تو ایلو ویرا آدھی توڑ کے چہرے اور بالوں پہ لگائی، باقی ماندہ دوپہر کے کھانے کے لیے رکھ دی، پیٹ میں درد اُٹھا تو پودینے کے پتے اُبال کر قہوہ بنا لیا۔

اس سے پہلے کہ ہم سوچ کی وادیوں میں مزید آگے بڑھتے اچانک دروزے کی گھنٹی بجی اوہو! یہ اس وقت کون آ گیا؟ دیکھا تو پڑوسن کا بچہ ہاتھ میں ساگ اور پالک لیے کھڑا تھا ،سلام دعا کے بعد بولا" اماں نے یہ آپ کے لیے بھجوایا ہے، گاؤں سے آیا تھا، کچھ بچ گیا، اماں نے کہا کہ آنٹی کو دے آؤ۔ ہم بچے کی اس سچی بات پر غصے کے کڑوے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ چار و نا چار شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا کہ چلو آج کا دن گزر جائے گا۔ ابھی ہم دروازہ بند کر کے پلٹے ہی تھے کہ گھنٹی ایک دفعہ پھر بج اُٹھی، دروازہ کھولا تو سامنے ماسی دودھ کے دو تین برتن سر پر لیے کھڑی تھی۔ آج پانی میں دودھ کچھ زیادہ لگ رہا تھا، ہمارے استسفار پر بولی، (پنجابی سے اُردو میں ترجمہ اختصار کے ساتھ) بس جی کیا کریں؟ برف

ڈالنی پڑتی ہے، بعد میں یہ پانی بن جاتا ہے، قسم لے لو بی بی جی، اگر الگ سے ذرا سا بھی پانی ڈالا ہو۔ ماسی نے معقول سائینسی فارمولا دلائل سے بیان کیا۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر کی خبریں کسی اخباری رپورٹر کی طرح سنانی شروع کر دیں، ہم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رُکنے کا سگنل دیا، دوسرے ہاتھ سے دروازہ بند کیا۔ ماسی گئی تو سوچا توبہ! کتنی خبریں ہوتی ہیں اس کے پاس۔ اس کو تو کوئی اپنا، نیوز چینل کھول لینا چاہیے۔۔ ایمان سے چلتی پھرتی اخباری رپورٹر ہے۔ بھلا اس سے زیادہ تیز، اس سے زیادہ آگے اور اس سے زیادہ ہر ایک پر کس کی نظر ہوگی۔ جیو ماسی!۔

ہم نے اپنے خیالات کو جھٹکا اور ساگ کو دھونے کے بعد کاٹنے کی غرض سے چھری اور بڑی سی پرات لے کر صحن میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ اُف! اب ایک ایک پتے کو کون چنے۔ ہم نے ساگ کو ایک ترتیب سے رکھا اور چھری چلا دی۔ ساگ کاٹتے ہوئے چرر، چرر کی مدھر آواز نے ہمیں مسحور کر دیا۔

بچے اور میاں جی، مقررہ وقت پر گھر میں موجود تھے۔ ہم نے قرینے سے ٹیبل سجائی، ساگ ہنڈیا سے نکال کر رکھا، ہمارے اہل وعیال نے جو ساگ دیکھا تو چلائے۔ ہم نے یہ کھانا نہیں کھانا۔ کیوں بھئی؟ کیا سکول سے مار اور دفتر سے ڈانٹ کھا کر آرہے ہیں۔ ہم نے بچوں کو غصے سے اور اُن کو پیار سے پوچھا۔۔ سب ایک ساتھ بولے بس ہم یہ "پتے" نہیں کھائیں گے۔ ہیں! کیا کہا؟ کیا تم سب کی عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے؟ یہ تو ہمارے دیس پنجاب کی خاص ثقافتی ڈش ہے۔ اب ہماری یہ ہی تو ایک پہچان رہ گئی ہے۔ حب الوطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ جذباتی سے ہو گئے۔ مزید قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس میں spinach بھی تو ہے، اسے تو پاپا بھی شوق سے کھاتا ہے، دیکھا نہیں ٹی وی میں۔ پاپا کے نام پر میاں جی چونکے، ان کے چہرے پر حیرت نمایاں تھی، احتجاجا

بولے۔ ارے بھئی، میں کب کھاتا ہوں؟ اوہو! آپ کا نہیں کہا۔ وہ جو کانگڑی سانہیں ہے popay the sailor man دیکھانہیں کیسے پالک کھاتا ہے، اس میں آئرن بھی تو ہے۔ ساگ نہیں کھاؤ گے تو بڑے کیسے ہو گے؟ ہمارے یوں قائل کرنے پر، سب نے جیسے تیسے کر کے کھانا زہر مار کرلیا۔

اگلے دن گھر کی صفائی ابھی شروع ہی کی تھی کہ اچانک فقیر نے دروازے پر آ کر صدا لگائی بی بی جی، کچھ کھانے کو دے دو، ساتھ ہی کھانا کھلانے پر مشروط دعا دینے کا طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ ہم دروازے پر گئے، فقیر سے پوچھا کیا کل کا سالن کھالو گے؟ فقیر خوشی خوشی بولا۔ ہاں جی۔ ہم نے اطمینان سے جواب دیا، اچھا تو پھر کل آنا۔

آج ہم بازار گئے۔ گوشت اور سبزی کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں جیسے وہاں موجود کسی خلائی مخلوق سے کہہ رہی ہوں،" اُتے ای رہنا۔ تھلے نا آنا، قسمے! بڑی ظلالت اے (یہ انگلش سے پنجابی میں اختصار سے اور بڑی مشکل سے ترجمہ کیا ہے۔)

آلو، جو غریب کی سبزی سمجھی جاتی ہے، (حالانکہ اس کا غریب کے گھر سے دور دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔) 60 سے لے کر 70 روپے فی کلو تک فروخت ہو رہا تھا۔ مرغی کا گوشت بھی ہاتھ سے بھاگا جاتا تھا۔ دھنیا، سبز مرچ جسے عوام مفت کا مال سمجھتی رہی تھی، اب سبزی کے ساتھ فری نہیں بلکہ پیسوں کے ساتھ الگ سے فروخت ہوتا ہے۔ بہت عیاشی کر لی عوام نے ۔بازار سے واپسی پر پرس ہلکا اور دل پر بھاری بوجھ تھا۔

اگر مہنگائی کا یہ ہی حال رہا تو کچھ عرصہ کے بعد مائیں اپنے بچوں کو سبزی، پھلوں اور گوشت کی تصویریں دکھا دکھا کر ڈرایا کریں گی۔ مانا کہ مہنگائی ہے مگر جنس کا تو کم از کم کوئی حجم ہو۔ ایک روپے کی، ایک ٹافی اور وہ بھی یہ ذراسی۔ مُنہ میں رکھتے ہی گھل جائے۔ ذائقہ محسوس ہوا نہیں کہ ختم۔ اور تو اور پیکٹوں میں چیز کم اور ہوا زیادہ بھری ہوئی ہوتی ہے۔ کھولو، تو اس کے

کونے میں کہیں دور، چپس یا نمکو پڑے ملیں گے۔ بعد میں بچے اسی پیکٹ کو پٹاخے کی طرح پھاڑ کر باقی ماندہ خوشی پوری کر لیتے ہیں۔ پتا نہیں کس ماہر معاشیات نے یہ مشورہ دیا ہے کہ غریب عوام کو جتنا لوٹ سکتے ہو لوٹ لو، قیمتیں بڑھا دو۔ سائز گھٹا دو اور پھر خوب منافع کماؤ۔۔واہ صاحب! واہ۔۔ بہت خوب۔! کیا ہی اچھی logic ہے۔

معاف کیجیے گا، شک سا ہو رہا ہے کہ ہم کہیں پھر سے جذباتی تو نہیں ہو رہے۔ غالبا بھوک کی شدت نے غریبوں کی بھوک کا احساس دلا دیا ہے۔ اس میں ہمارا بھی کیا قصور۔ مہنگائی ہی اس قدر ہوگئی ہے کہ الامان الحفیظ۔۔!

ہمارے ملک میں کتنے ایسے غریب ہیں کہ جن کو دو وقت کی روٹی تک نصیب نہیں، ہم ان کا دکھ محسوس کر کے مزید دکھی ہو گئے، اسی دوران میں گھڑی دیکھی تو اوسان خطا ہو گئے۔ سب کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔

بچوں اور میاں نے آتے ہی کھانے کی فرمائش کر دی۔ ہم نے ایک سرد آہ بھری۔ لہجے میں دکھ کی آمیزش شامل کی اور کہا۔ آج کیا تاریخ ہے؟ سب نے اس غیر متوقع سوال پر حیرت سے دیکھا! ارے بھئی، آج 28 مئی، غربت کا عالمی دن ہے، اس لئے ان سے اظہارِ یکجہتی کے لئے، آج ہم نے کھانا نہیں بنایا۔ کیا؟ سب ایک ساتھ چلائے۔ ان کی آواز پورے گھر میں گونج اٹھی۔ اُس دن کے بعد سے بچوں نے بسکٹ پر اور میاں نے صبر کے گھونٹ پی کے گزارا کرنا سیکھ لیا۔

خاکا

خالد قیوم تنولی

شمشیر

اظہارِ محبت کے بے شمار انداز ہیں۔ ایک ہمیں بھی یاد ہے۔ کراچی میں ہمارے ایک دوست ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے حجام مگر مزاج کے بادشاہ واقع ہوئے ہیں۔ رنگت بلالی نقوش جمالی اور تیور واطوار ہمہ وقت ہی جلالی۔ کبھی کبھار جو ہنس پڑیں تو لگتا ہے صدیوں کا خوابیدہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ آخری ملاقات ان سے پچھلے سال کے ماہ اپریل میں ہوئی تھی۔ ہم ملنے گئے۔ دکان گاہکوں سے خالی تھی لہذا موصوف اپنی ہی شیو بنانے میں مگن تھے۔ کوئی دس برس بعد ہمیں دیکھا تو مارے وارفتگی کے کرسی سے چھلانگ لگائی اور ناقابل اشاعت گالیاں دیتے ہوئے ہم سے آن لپٹے۔ ہمارے ہم عمر تو ہیں ہی ہم قامت بھی ہیں۔ ہمارا چہرہ بھی شیونگ سرف سے لتھڑ گیا۔

گلے شکوؤں اور مزاج پرسی کے طویل تبادلے کے بعد ہم نے کہا: "ماشاءاللہ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔"

"کیسے۔۔۔؟" خوش ہو کر پوچھا۔

ہم نے دکان کی اندرونی بدحالی پر نظر دوڑائی: "باپ کی طرح ہی عادت اور قسمت پائی ہے۔ گاہک صفائی اور کمائی سے آج بھی محروم۔"

جلال میں آ گئے۔ حجامتی مگا پانی سمیت ہماری طرف اچھال کر بولے: "ابے سات بچوں کا باپ ہوں۔"

قریب پڑے ایک غلیظ تولیے سے ہم نے اپنا منہ پونچھتے ہوئے طنز کا ایک اور وار کیا: "کہا جو ہے۔ باپ پر ہی گئے ہو۔"

خیر بہت دیر نوک جھونک جاری رہی۔۔۔مگر کہانی ہم نے اس انداز محبت کی سنانی ہے جو پچیس برس پرانی ہے۔

اور وہ کہانی کچھ یوں ھے کہ ہمارے بیروزگاری کے دن تھے۔ہم زیادہ تر شمشیر کی معیت میں اس کے والد کی اسی موجودہ دکان میں ہی پائے جاتے۔ والد اس کے اللہ بخشے رُوئے زمین کے سب سے زیادہ حال وقال مست شخص تھے۔ گھر ان کا دکان سے متصل تھا۔ کوئی بھولا بھٹکا گاہک آجاتا تو موصوف اسے ایک منٹ انتظار کرنے کو کہہ کر گھر کے اندر تشریف لے جاتے۔ تنگ آکر گاہک بیچارہ ایک گھنٹے بعد کسی اور نائی کی طرف نکل جاتا۔ بہت عرصہ ہم اس صورت حال کے شاہد رہے اور خدا کی قدرت پر حیران بھی۔ واقعی وہ لطیف و کریم ذات ہے۔توکل بر خدا کا ایسا معاملہ آج تک کہیں اور نہیں دیکھا۔سارا کنبہ ہی اللہ کی رضا پہ راضی واقع ہوا تھا۔ اخبار ہم وہیں پڑھتے۔ چائے وہیں پیتے جو گھر سے بھیجی جاتی تھی اور اکثر کھانا بھی جو دعوت شیراز کی مانند ہوتا۔اس ہر وقت کی قربت سے لوگ ہمیں بھی نائی ہی سمجھنے لگے تھے۔ شمشیر کو ان دنوں اپنے جدی پشتی پیشے سے سخت بیزاری تھی۔ کہا کرتا کہ یہ پیشہ اس کے معاشقے کا قاتل ثابت ہوسکتا ہے اگر چہ تب تک وہ کسی قسم کی عشقیہ سرگرمی میں مبتلا نہ ہوا تھا۔عشق تو اسے تب ہوا جب وہ فوج میں رضا کار بھرتی ہوا۔ ملیر کینٹ میں زیرِ تربیت تھا۔ ہر ویک اینڈ پر خاکی وردی پہنے گھر آتا اور دکان پر ہماری منڈلی جمتی تو بہت لمبی لمبی گپیں ہانکتا جس کی بیشتر فوجیوں کو عادت ہو جاتی ہے۔

ان گپوں پر سب سے زیادہ داد شمشیر کے والد محترم دیا کرتے۔ اس فن میں وہ بہت طاق تھے۔ کبھی ترنگ میں ہوتے تو اپنے ایامِ شباب کے توبہ شکن واقعات کو بارہ مصالحوں کے ساتھ سجا سنوار کر ہمارے دسترخوان سماعت پر لا رکھتے۔۔۔اور ہمیں اپنی بیکار جوانی پر بے طرح ترس آجاتا۔ جولیس سیزر کو جب سکندر یونانی کی فتوحاتِ عالم کا علم ہوا تو اس نے بھی

ہماری طرح تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا: "اب میرے کرنے کو کیا رہ گیا ہے۔"
ایک دن شمشیر نے ہمیں بتایا: "یار تیرا یار مر گیا۔۔۔"
ہم نے کہا: "یہ سستی فلموں کے گھٹیا مکالموں سے باز آجا۔ سدھی طرحیاں دس چکر کیہہ اے۔"
"I am in love yaar..."
"وہ کون اندھی ہے؟" ہم نے براہ راست جاننا چاہا۔
"عاشقوں کی نظر ہمیشہ کمزور ہی ہوتی ہے۔" یہ فلسفہ تھا اس عاشق کا۔
"ارے اندھے! میں معشوق کا پوچھ رہا ہوں۔" ہم ہنوز سنجیدہ تھے۔
فوجی بننے کے بعد اس کا نشانہ مزید پختہ ہو گیا تھا اس لیے ہم اگلا جواب کل پر چھوڑ کر سامنے سے ہٹ گئے۔ گولی کے زخم کی نسبت قینچی کی ضرب زیادہ تکلیف دیتی ہے۔
دو تین دن گزرے ہوں گے کہ وہ نہ رہ سکا اور ہماری ہمراہی میں ملاقات کو چلا۔ ہم سخت متجسس تھے۔ شب بھیگ چکی تھی (کراچی میں سارا سال اوس پڑتی ہے)۔ کتے اور چوکیدار بھی سو چکے تھے۔ کچی آبادی تھی۔ ہم اے بلاک سے ایف بلاک کی طرف افتاں و خیزاں اس کے باپ کی مجہول سائیکل پر سوار رواں دواں تھے۔ اوکھے پینڈے لمیاں راہواں عشق دیاں۔
شمشیر کی منزلِ مقصود۔ ومطلوب آئی تو اس نے ہمیں سائیکل تھمائی اور دعاؤں میں یاد رکھنے کی پُرزور تلقین کرتے ہوئے رزم گاہِ عشق کی جانب بڑھا۔ کوئی بیس گز کے فاصلے پر ایک گھر کے باہر پوری گلی کا اکلوتا بلب روشن تھا۔ ہم نے دیکھا وہ زمین کی طرف حالتِ رکوع میں گیا جب سیدھا ہوا تو بلب کی طرف کچھ پھینکا اور روشنی پلک جھپکتے میں فرار ہو گئی۔ منظر اندھا ہو گیا۔ عاشق اوجھل ہو گیا۔ معشوق کے متعلق صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا جو ہم نے نہیں لگایا۔ بس آنکھیں ہی ملتے رہ گئے۔
ملاقات کا دورانیہ کم و بیش دس منٹ کو محیط ہو گا۔ وہ واپس آیا تو بتایا کہ گلی میں کھڑے کھڑے بات چیت ہوئی ہے۔ آج کے لیے یہی کافی ہے۔

اس کے بعد ہم اس کے ساتھ پانچ چھ بار پھر گئے۔ اور ہر دفعہ یہی دیکھا کہ ایک نیا بلب اپنی روشن مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کرتا اور جب شمشیر ہڈی پتھر کوئلہ یا کسی بھی ٹھوس چیز سے نشانہ لیتا تو روشنی بلب کے قہقہے سمیت روپوش ہو جاتی۔ روشنی کی اس ملی بھگت پر ہم آخری بار بہت چراغ پا ہوئے جب حسب معمول شمشیر نے ایک روڑے سے ہدف کا نشانہ لیا جو خطا تو نہ ہوا البتہ ایک ثانیے کے لیے بلب پہلے بجھا اور دوبارہ دمک اٹھا اور ہم زور سے ہنس پڑے۔ شمشیر نے پلٹ کر ایک نظر ہمیں دیکھا اور پھر بلب کو۔ غالباً اس نے گالی بھی دی ہو گی۔ اسی اثنا میں ہمیں بلب کا پٹاخا سنائی دیا۔ شمشیر دوڑ کر واپس آیا اور ہنستے ہوئے بولا: " لالے! زیادہ خوش نہ ہو۔ ایہہ عشق دیاں سٹاں کدی قضائیں ہوندیاں۔"

اور ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ پھر ہمیں سرکاری ملازمت مل گئی اور تبادلہ کراچی سے واہ کینٹ ہو گیا۔ شمشیر کا عشق اس کی یاد کے پس منظر میں کہیں رہ گیا۔

2002ء میں ہمارے چھوٹے بھائی جاوید قیوم کی شہادت کا سن کر شمشیر تعزیت کو آیا۔ باتوں باتوں میں ہم نے اس کے معاشقے کے بارے پوچھا تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا: " جا پتر بے بے کو بتا کہ جیٹھ صاحب بلا رہے ہیں۔"

بچہ زنان خانے کی طرف لپکا اور اگلے چند لمحوں میں ایک خوب گوری چٹی خاتون نے ہمیں سلام کیا۔

شمشیر نے مسکراتے ہوئے کہا: " لے بھئی! دیکھ! پسند آئی بھابھی؟۔۔۔ یہ وہی تو ہے۔"

یہ سن کر ہم مارے حیرت اور خوشی کے ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ بھابھی سے ہم اتنا ہی پوچھ سکے کہ بلب باقاعدگی سے کون تبدیل کرتا تھا؟

ہمارے اس احمقانہ سوال کا جواب بھی شمشیر نے ہی دیا: " بلب بجھنے سے یہ سمجھ جاتی تھی کہ قیدی کی ملاقات آئی ہے۔ بلب کا انتظام بھی اسی کے ذمے تھا۔"

فرحین چودھری

سلمان باسط: ادبی پہلوان

پرانے زمانوں میں جب کسی سے دشمنی ہوتی تھی تو کہا جاتا تا تھا کہ میں فلاں کو پاتال سے بھی کھینچ نکالوں گا آج یہ چنداں مشکل نہیں رہا۔بھلا ہو موبائل فون کا نہ آپ چھپ سکتے ہیں نہ کوئی بہانہ یا عذر پیش کر سکتے ہیں۔ یہ تو جہانگیر کی زنجیر عدل سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے۔کم از کم اُس کی آواز جہانگیر کے واش روم تک تو نہ جاتی ہوگی اگر جاتی بھی ہوگی تو فوری جواب دینے سے بچ جاتا ہوگا۔

دوپہر کے ٹھیک سوا دو بجے ،جب آپ گاڑی چلا رہے ہو تو واہ سے ایک شخص آپ کو موبائل پر فون کرے جس پر آپ نے پہلا مضمون تب پڑھا ہو جب آپ اُس سے ملے نہ ہوں اور دوسرے مضمون کا آڈر تب آجائے جب محض اتنی سی بات ہوئی ہو 'آپ کا مضمون بہت اچھا تھا بہت محبت سے لکھا تھا تو اب ایک اور تقریب میں لکھ کر پڑھ دیجے' مجھے بالکل یوں لگا جیسے کہ میرا مضمون کوئی اشتہار ہو

''مصنف سے ملنے سے پہلے۔۔۔۔مصنف سے ملنے کے بعد۔۔۔فرق صاف ظاہر ہے''

انگلش کا پروفیسر لہجے سے اردو کا شہد ٹپکائے تو انکار کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔

سفید پوشوں کے ایک ہجوم کے ساتھ ہال میں داخل ہونے والا وہ پر جم سا آدمی جب مسکرایا تو دانتوں کی تجلی کے بیچ ایک ننھا سا بلیک ہول اُس کی خوش قسمتی کی داد دے رہا تھا۔

پروفیسر تو شاید طوعاً کرہاً تسلیم کر بھی لیا جائے مگر رائٹر اور وہ بھی مزاح نگار،سلمان باسط ہرگز نہیں لگتا۔ مجھے تو یوں لگا جیسے اندرون لاہور کی کسی دودھ دہی کی دوکان سے اُٹھ کر کوئی پہلوان جی آ گئے ہیں۔اور ابھی آواز لگائے گیں ''لسی پیو ساریاں نوں''

لیکن اُس کی نمی نمی مسکراہٹ اور شرارت سے بھرپور آنکھوں میں سارے امیج کا ستیاں ناس مار دیا تھا۔ آخر وقت تک مجھے امید رہی کہ وہ ابھی اُٹھ کر ایک آدھ بڑھک ہی مار دے گا۔ مگر امید کی شمع روشن نہ ہوسکی۔ وہ جب ڈائس پر آیا تو ایسا دھیما دھیما سٹائل تھا جی حضوری قسم کا کی حیرت ہونے لگی۔ ارے بندہ اے خدا کچھ اپنے پھیلاؤ کی ہی لاج رکھ لی ہوتی۔۔۔ پکا میسنا نکلا یہ تو! پہلا مضمون پڑھا تو صرف نام سے واقفیت تھی اور اب دوسرے مضمون کے وقت محض چہرہ شناسی اور دو جملوں کا تبادلہ۔۔۔ اس کسمپرسی کی حالت میں سلمان باسط کے نام اور کام سے انصاف کر پاتی ہوں یا نہیں، نتیجے کے ذمے دار وہ خود ہونگے۔

کتاب پر بھی تصویر دیکھ کر لگتا ہے کہ سلمان باسط ادبی اکھاڑے ہی کے نہیں بلکہ کسی اصلی اکھاڑے کے پہلوان ہیں لیکن 'خاکی خاکوں' کی خاک جوں جوں جھڑتی گئی اہل خاکہ کے ساتھ ساتھ سلمان باسط کے نقش بھی سنورتے گئے۔

'خاکی خاکے' پڑھتے ہوئے یوں لگا کہ اوئے اوئے کہہ کر دوسرں کا مذاق اڑانے اور پھر روتے ہوئے کو بھاگ کر چپ کرانے والے اس شریر سے بچے کے ساتھ شاہد میں بچپن میں کھیلتی رہی ہوں۔ وہی چھیڑ خانیاں، وہی من مانیاں، وہی جولانیاں اور آخر میں وہی پشیمانیاں۔

اُس نے آئینے کے سامنے کبھی منشا یاد کو لا کھڑا کیا، کبھی انور مسعود کو تو کبھی جلیل عالی کو۔۔ مگر پیچھے کھڑا اپنی چھب بھی دکھلاتا رہا کسی نخریلی، نئی نویلی دلہن کی طرح، جو صحن میں بیٹھے دلہا کو کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے جھانک رہی ہوتی ہے اور اُوٹ میں چھپ کے بلاوا بھی دے رہی ہوتی ہے۔

سلمان باسط نے بھی یہی سٹریجی استعمال کی ہے۔ اُس نے تمام شخصیات کے، سچائی، محبت اور معصومیت جیسے اوصاف کو دوستی کی بنیاد بنا کر گویا اپنے آپ کو سچا کھرا اور محبت کرنے والا ثابت کر دیا۔ اُن کی کمزوریوں پر پردہ ڈال کر فراخ دلی سے اُنھیں اپنانے

کا اعلان کر کے، اپنے قد کو مزید بڑا کر لیا ہے اور دیو نظر آنے لگا ہے (کتاب پر چھپی تصویر کے عین مطابق) جس کا اقرار وہ خود ان الفاظ میں کرتا ہے 'سلمان باسط پہلی نظر میں ہٹلر کا رشتے دار نظر آتا ہے'۔

خود ستائی کا عالم دیکھیے 'انگریزی کا پروفیسر ہونے کے باوجود اردو اور پنجابی میں اُس کی دلچسپی کئی لوگوں کے نزدیک خاصی حیران کن، کچھ کے نزدیک پریشان کن اور بیگم کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے'۔

چند ایسی شخصیات کے خاکے بھی اس کتاب میں شامل ہیں جنھیں آپ کبھی نہ ملنے کے باوجود بھی ملتے ہی پہچان جائیں گے۔سلمان باسط نے اتنی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں سامنے رکھ دی ہیں کیہ نا پہچاننے والے کی اپنی بینائی مشتبہ قرار دی جاسکتی ہے۔مثلاً اظہار الحق سے میری ملاقات نہیں لیکن جہاں یہ حلیہ فٹ بیٹھے گا میں ٹھک سے آواز دے دو ں گی کہ جناب اظہار الحق صاحب ذرا اظہار حق کی اجازت تو دیجئے۔

سلمان باسط اُن کے بارے میں لکھتے ہیں ۔'اظہار الحق کے عناصر ترکیبی بھی دوسروں سے مختلف ہیں وہ صاحب جلال، شاعر جمال۔ فارغ بال اور کثیر العیال ہیں۔وہ افسر غضب کا، شاعر ڈھب کا کثیر العیال اب کا اور فارغ بال کب کا ہے'

اگر اب بھی نہ پہچان پاؤں تو کج فہمی میری۔

'انور مسعود سے بار ہا ملنے کے بعد بھی جو اولین تاثر، دیسی گھی کی خوشبو سمیت ذہن سے چپک گیا ہے وہ ہی سلمان باسط کی رائے ہے'۔

'اُس کی چہرے کے عضلات سے گندلوں کے ساگ اور مکی کی روٹی کی ک جھلک اُس کے دیہاتی پن کی چغلی کھاتی ہے۔اُس کی بتیسی بھری مسکراہٹ اُسے ایک سیکنڈ میں جناح سپر سے جلال پور جٹاں لا کھڑا کرتی ہے'۔

انور مسعود کی اس سے زیادہ اچھی ڈیفینشن ہو ہی نہیں سکتی ۔اور شکر کریں انور مسعود کہ وہ مجمع باز ہی کہلائے' اگر بنیان کے حوالے سے سلمان کوئی نئی اختراع کر دیتے تو انور مسعود کیا کر دلیتے ؟ ۔

اسی طرح جلیل عالی کی معصومیت شرافت ۔منکسر مزاجی اور ذود رنجی کے تو ہم بھی کئی سالوں سے گواہ ہیں ۔ہم بھی چاہتے ہیں کے وہ دل کی دل میں رکھنے کے بجائے کبھی کبھار بھڑاس سڑاش نکال لیا کریئں مگر صرف اُن کے سامنے ، جن سے اُن کے سفاری سوٹ عینک اور سر کے چاند کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ۔

روف امیر کے جثے اور لہجے کی گھن گرج پورے خاکے میں جا بجا سنائی دیتی ہے ۔ظاہر ہے آرڈینس فیکٹری کی ص صحبت کا کچھ تو اثر ہوگا ۔پٹاخے ، پھلجھڑیاں بھی چھوٹے گئے اور دھماکے بھی ہونگے ۔ہوسکتا ہے کہ سلمان باسط پر تن و توش کی جو دین ہے وہ اس پہاڑ کے وجود کو انٹی کرنے کے لئے ہو۔ورنہ تو پہاڑ اور گلہری والی نظم تو سبھی کو آتی ہے ۔

شراتوں کے بیچ چٹکیاں لیتا ہوا سلمان باسط کا وجود اُس وقت قطرہ قطرہ پگھلتا محسوس ہوتا ہے جب وہ محبتوں کی بات کرتا ہے۔اپنے بڑے بھائی عثمان خاور کے بارے میں لکھتا ہے۔

''میری خامیوں اور غلطیوں کو اُس نے کبھی بے نقاب نہیں ہونے دیا۔زمانے کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلنا سیکھایا۔سچ تو یہ ہے کہ میں آج بھی اُس کی انگلی تھام کر چلتا ہو ں ۔زمانے کے گرم و سرد میں جب اُس کی محبت یلغار کرتی ہے تو کسی تشکر آمیز لمحے میں میری آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے ہیں'' ۔

غفور شاہ کے قرض حسنہ کا بطور خاص ذکر ہے اُن کے خاکے میں ۔۔۔اُنھیں قرض حسنہ ملے نہ ملے لیکن اُن کا خاکہ پڑھ کر ہم پر ہنسنا ضرور فرض ہو جاتا ہے۔مثلاً دیکھیے سلمان باسط کا قلم کیا کرشمہ دیکھتا ہے۔

'غفور شاہ کم خوراکی کو دانش مندی سمجھتا ہے حالانکہ کہ اُس کے پچاس کلو کے جسم میں دانش مندی کی ایک چھٹانک بھی نہیں۔ اگر اُس کا فلسفہ صحیح ہوتا تو ہم جیسے خوش خوراک دانش کے قرب وجوار میں بھی نظر نہ آتے۔

منشا یاد کے نام کے ساتھ خوب داؤ پیچ کھیلے ہیں اس ادبی نسل کے پہلوان نے ۔۔۔منشا یاد بھی حسبِ منشا بہت سی باتیں یاد رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں کوئی بھی وار خالی نہیں جانے دیا اور اکھاڑا ہی اکھاڑ پھینکا۔

برحال داد دینی چاہے کہ سلمان باسط اپنی نیٹ پریکٹس جاری رکھتا ہے اور کون جانے کس وقت، کسے، کس حال میں پیچ پر لا کھڑا کرے۔

احسان بن مجید

وہ تم ہی تھے

میں اپنی شادی کا کارڈ بہت چاؤ سے اُسے دینے گیا تھا، میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کارڈ لینے سے انکار کردے گا، چٹی نہ_ منکر کہیں کا......میرے ذہن میں کئی طرح کے خیال آئے مگر جیسے آئے ویسے ہی رخصت ہو گئے۔ وہ میرا دیرینہ دوست تھا اور ہم نے اپنے سینے چیر کر ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیے تھے۔ میرے اصرار پر اُس نے کارڈ لے کر میز کی بائیں جانب پڑے آؤٹ ٹرے میں رکھ دیا تھا۔ اس کی بے دلی سے میں بھانپ گیا تھا کہ وہ میری شادی میں شریک نہیں ہوگا جس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی، اس نے سچ کر دکھایا، شادی کے ہنگاموں میں میری نظریں اُسے تلاش کرتی رہیں مگر وہ ہوتا تو نظر آتا۔ ولیمے کے بعد گھر میں جیسے ایک سکون سا ہو گیا، تنہائی لوٹ گئی تھی اور اب ایک سایا سا میرے سنگ رہنے لگا تھا، ایک خوشبو سی میرے بدن کے طواف میں رہنے لگی تھی۔ دفتری مصروفیات کے باعث چند دن بیت گئے لیکن ایک دن اچانک ہمارا آمنا سامنا ہو گیا، میں نے دیکھا اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ اُتر آئی تھی، میں نے فوراً اپنے لباس کا جائزہ لیا، مبادا کوئی زپ ZIP کھلی رہ گئی ہو لیکن ایسا کچھ نہیں تھا، میں نے اسے دیکھا، مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے عقب میں چلی گئی تھی اور اب ایک سنجیدہ شخص میرے سامنے کھڑا تھا، شرمسار سا، اپنے ہی پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا، میں نے کوئی گلہ شکوہ کیا نہ کرنا چاہتا تھا، میرا یہی عمل اس کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوا، یہی وجہ ہوئی کہ ہم میں دوستی کی تجدید ہوئی۔

آسودہ نظروں نے مجھے کئی بار نا آسودہ کیا، جذبوں کا ایک خمار تھا جو وقت کے دریا میں بہہ گیا تھا، بھید کے سارے پردے چاک ہو چکے تھے اور زندگی اب کولہو کے بیل کی طرح ہو گئی تھی، ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا لیکن ہر ملاقات میرے دامن میں

ایک الجھن ڈال جاتی، وہ کھل کھلاتا آتا لیکن میرے پاس پہنچتے ہی اس کا چہرہ مرجھا جاتا، وہ قہقہہ لگاتا لیکن اس کے قہقہے میں ایک فریاد کی بازگشت الگ ہو کر میری سماعت کا حصہ بن جاتی یوں جیسے اعترافِ شکست کی کوئی بات ہو اور ہتھیار ڈالنے کا جان لیوا عمل قریب تر ہو، بظاہر کڑیل ہوتے ہوئے وہ اندر سے مسمار ہو چکا تھا، اس کی چمکتی نظریں ماند پڑ چکی تھیں، کئی بار میرا جی چاہا اس کے اندر جھانک کر دیکھوں کہاں آگ لگی ہے، کیسے لگی ہے، کیا باعث ہے، وہ کیوں صحرا نوردی پر اُتر آیا ہے کہ اس کی چار سُو بگولے رقص کرتے ہیں، وہ اکثر باتیں کرتے ہوئے کھوسا جاتا یوں جیسے باتوں کے تسلسل میں رخنہ آ گیا ہو، لیکن میرے اندر سے آواز آتی، اس کو کریدنا منع ہے، یہ شخص زخمی ہے ایسا کرنا اس کے زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہوگا، میں خاموش ہو جاتا۔

اوئے، بولو ناں! اس سے میری خاموشی بھی برداشت نہیں ہوتی تھی یا پھر میری باتوں سے لفظ چُن چُن کر کوئی مالا تیار کرتا ہوگا، مجھے لگتا یہ اس کی اپنی آواز نہ ہو بلکہ کوئی اور اس کے اندر بول رہا ہو، میں کان دھرتا، سراپا متوجہ ہوتا لیکن کچھ سمجھ نہ پاتا، وہ میرے لیے معمّا بنتا جا رہا تھا۔ وہ چونکہ میرا لنگوٹیا تھا اس لیے مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی، اس کے سینے میں بے ترتیب دھڑکنیں اچھالتا دل جیسے مجھے نظر آنے لگا تھا، سوالات سے اَٹا چہرہ روز بہ روز اُترتا جا رہا تھا یوں جیسے کسی پودے کو بروقت پانی نہ ملے تو اس کی کونپلیں مرجھا کر فریاد کرتی ہیں۔

ایک ملاقات پر اسے دیکھتے ہی جیسے میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا ''تمھیں کیا ہوتا جا رہا ہے، ایسا کون سا کرب ہے جس میں تم مجھے شامل نہیں کرنا چاہتے''، سوال خود بہ خود میری زبان سے پھسل گیا تھا، اس کے چہرے کا چاند جیسے کسی بدلی کی اوٹ میں چلا گیا اور جانے کتنے عفریت دوڑے چلے آئے۔ مَیں اسے قریب کے کیفے ٹیریا میں لے گیا اور ہم ایک گوشۂ عافیت میں جا بیٹھے۔ اب بتا کیا بیت رہی ہے تجھ پر! مَیں نے سگریٹ کا بھرپور کش

لیتے ہوئے نظریں اس کے چہرے پر پھیلا دیں اوراس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔
کیا ہوا، کچھ بھی نہیں، کھاتا پیتا ہوں، سوتا ہوں، دوستوں سے ملتا ہوں اور اُن لوگوں سے بھی ملتا ہوں جن سے مَیں ملنا نہیں چاہتا! اس نے یوں کہا جیسے پہلے سے رَٹ رکھا ہو۔

ہور چُو پو، میرے حلق میں ایک اور کانٹا اَٹک گیا، کون سے ایسے لوگ ہیں جن سے وہ ملنا نہیں چاہتا لیکن ان سے ملنا اس کی مجبوری بن گیا ہے، کیا ان میں کوئی بلیک میلر ہے، شرابی، جواری ہے یا اور کسی دھندے میں ملوث کچھ لوگ ہیں، میرے ذہن میں سوالوں کی ایک قطار سی بن گئی اور میں نے ان کے جواب ڈھونڈنے کے لیے کمر کس لی، میں اس کے دفتر کے اِرد گرد یوں بھنبھنانے لگا کہ اسے خبر نہ ہو، چند روز یوں ہی بیت گئے، میں دیکھتا رہا، لوگ اس کے دفتر میں داخل ہوتے اور نکلتے رہے لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس پر انگلی رکھی جا سکے، کچھ دن مجھے اپنے دفتر میں مصروف رہنا پڑا، صبح گھر سے نکلتا تو لوٹتے ہوئے شام گہری ہو چکی ہوتی، شادی کے بعد میری زندگی ایک ڈھب پر آ چکی تھی، کچھ معمولات بدل چکے تھے، ایسا تو ہونا تھا، ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے۔

مصروفیت کا سیلاب اُترا تو ایک بار پھر میں نے اپنے جگری یار کی نگرانی شروع کر دی، اس دوران ہماری طویل ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں اور مَیں محسوس کرتا رہا اس کے چہرے کی شادابی لوٹ رہی ہے، عجیب آدمی ہے گرنے پر آتا ہے تو پاتال میں اُتر جاتا ہے اور قہقہے برسانے پر آتا ہے تو لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ مَیں خود کلامی کرتا۔

دن کے دس بجے کا وقت ہو گا کہ اب تک میں نے دفتر میں کوئی کام نہیں کیا، کام تھا ہی نہیں، اس کے بعد بھی دو تین گھنٹے فارغ تھے اس لیے سوچا، ٹی بریک آج گھر کرنی چاہیے پس اپنے کولیگ کو بتا کر گھر روانہ ہو گیا۔ سیڑھیاں عبور کرتے ہی میں تاڑ گیا میری بیوی گھر پر نہیں ہے، معلوم کرنے پر پتا چلا بازار گئی ہے، موڈ تھوڑا آف ہوا لیکن سنبھل

گیااور دوست کے دفتر گپ شپ کے لیے نکل گیا۔ گاڑی سے بیس منٹ کی مسافت تھی۔
میں گاڑی سے اُتر کر اس کے دفتر تک پہنچا تو باہر بیٹھے چپڑاسی نے مجھے روک لیا۔
سر میٹنگ ہونے والی ہے آپ اندر نہ جائیں......
صاحب کے پاس کتنے لوگ بیٹھے ہیں......
ابھی تو جی ایک خاتون افسر ہی بیٹھی ہیں......
او نکمے! میں بھی میٹنگ کے لیے آیا ہوں......
اچھا سر!

میں چپڑاسی سے مزید کچھ کہے بغیر آگے بڑھا اور دفتر کا پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہو گیا، مجھے دیکھتے ہی میرے دوست اور خاتون کے چہرے زرد پڑ گئے یوں جیسے کوئی رنگے ہاتھوں گناہ کرتے پکڑا جائے، دونوں کے دہانے کھلے، تم اس وقت ___ آپ یہاں ___
ہاں، میں اس وقت یہاں ___ مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھتا، میری سٹی گم ہو جاتی، ایسا نہیں ہوا لیکن اسی لمحے میرے ذہن کے گنبد میں ایک صدا گونجی، وہ تم ہی تھے میرے دوست میں جس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔

محمد الیاس

ہمدردی

اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب، شریف اور سگھڑ لڑکی کا قصور اتنا ہی تھا کہ رائج الوقت معیار کے مطابق سمارٹ نہ تھی۔ قد چھوٹا اور جسم بھاری۔ بے رحمانہ فاقہ کشی کرنے اور مہنگا علاج کروانے کے باوجود وزن قابو میں نہ رہتا۔ اس پر مستزاد، رنگ رُوپ اور نین نقش کے معاملے میں بھی قدرت مہربان نہ ہوئی تھی۔ لوگ ظاہری حُسن دیکھتے ہیں، جب کہ اولاد کی شخصی خوبیوں کا ادراک صحیح معنوں میں صرف والدین کو ہوتا ہے۔ ثمرہ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی رہا کہ باپ کو اس کے ذی شعور، باتمیز اور سمجھ دار ہونے پر فخر تھا۔ رزق کی فراوانی تھی۔ مال و دولت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں عزت و وقار کی نعمت بھی حاصل رہی۔ حاجی مقبول الٰہی کی زندگی میں ایک ہی کمی رہ گئی کہ حسبِ منشا بیٹی کا کہیں رشتہ طے نہیں ہو رہا تھا۔

پہلا دھوکا بیوہ بھابھی کی طرف سے ہوا۔ بیٹے سے باقاعدہ ساز باز کر کے رشتہ مانگا۔ بڑے چاؤ سے منگنی کی۔ چند روز بعد ہی ماں بیٹا خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئے اور خوش خبری سنائی کہ آکسفورڈ میں داخلہ ہو گیا ہے۔ چلتّر باز عورت نے ہنس کر چٹکی بجائی اور بولی: ”دیور جی! دو سال ایسے چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔ واپس آتے ہی سب سے پہلے شادی، پھر کوئی اور کام۔ خوب دُھوم دھام سے ثمرہ کو دُلہن بنا کر گھر لے جاؤں گی۔“ بیٹا، ماں سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ کہنے لگا: ”جوں ہی ڈگری ہاتھ میں آئی، آپ یوں سمجھ لیں کہ سِکس فِگر میں سیلری کا آفر لیٹر کراچی، اسلام آباد سے جاری ہو جائے گا۔ ماں بیٹا بڑی آسانی سے سولہ لاکھ روپے کی رقم ہتھیا کر لے گئے اور چھ مہینے پورے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ منگنی توڑ دی۔

ثمرہ کے سگے ماموں نے بیٹے کے لیے ڈرتے ڈرتے رشتہ مانگ لیا۔ حاجی مقبول کو دل میں

ملال آیا کہ میٹرک پاس لڑکا اس کا گھر داماد بنے گا، جو پیشے کے اعتبار سے محض ڈرائیور ہے۔ سات مرلے کا معمولی سا گھر اور روزی کا وسیلہ صرف سوزوکی ڈبّا جس سے تعلیمی ادارے کو پک اینڈ ڈراپ سروس مہیّا کی جارہی ہے۔ گو کہ بیٹی نے منفی ردِعمل ظاہر نہ کیا لیکن باپ کا اپنا دل ہی نہ مانا۔ دھیان بار بار اپنی بہن کی طرف چلا جاتا، جس کی زندگی بھر دامے درمے سخنے مدد کرتا رہا تھا۔ دل کڑا کر کے از خود عندیہ دے ڈالا۔ بہن پریشان ہو کر بول پڑی: ''بھائی جان! آپ کے بڑے احسانات ہیں لیکن میرا بیٹا منہ زور ہے۔ جب بھابھی نے منگنی توڑی تو میں نے اپنے طور پر گھر میں سرسری سی بات چلائی تھی لیکن کسی نے میرا ساتھ نہ دیا۔'' اسی طرح آئے روز نت نئے لوگ لڑکی دیکھنے آتے، خوب مدارات کرواتے اور گھر جا کر خاموش ہو رہتے۔ آخر کار حاجی نے بیوی کی رائے کو صائب جانتے ہوئے اتفاق کر لیا کہ وہ اپنی بہن کو اعتماد میں لے کر بات کر لے۔ گو کہ نچلے درجے کا متوسط گھرانا ہے لیکن تعلیمی قابلیت کے حوالے سے لڑکے کی اٹھان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایم فِل کرتے ہی پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کی اور بطور لیکچرار عملی زندگی کا آغاز کر دیا۔ ارادے بلند ہیں۔ انشا اللہ پی ایچ ڈی بھی ضرور اپنے وقت پر کر لے گا۔ باقی یہ کہ بیٹی کا شرعاً جو حصہ بنتا ہے، اس میں گاڑی اور زندگی کی ہر آسائش مہیا ہو جائے گی۔ بس یہ کہ میری اکلوتی بیٹی کو اللہ تعالیٰ ایسا شریکِ حیات عطا کر دے جو اس کی خوبیاں کو پرکھ سکے اور دل سے قدر کرے۔ دل میں ٹھان لی کہ آصف نے اگر اچھا داماد، خصوصاً محبت کرنا والا شوہر ہونے کا ثبوت دیا تو پہلے بچے کی پیدائش پر بیٹی کو پوش ایریا میں گھر بھی لے دوں گا۔ دانا شخص نے خوب سوچ بچار کر کے بیوی سے کہا: ''نجمہ بیگم! میری جائیداد میں بیٹی کا معقول حصہ بنتا ہے۔ بیٹے کی ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی، لہٰذا فی الحال تقسیم کی بات کرنا قبل از وقت ہو گا اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ کوئی شخص دولت کے لالچ میں میری بیٹی کا رشتہ قبول کرے۔ اس لیے سرِ دست تم نے اپنی بہن کے ساتھ کوئی

ایسی بڑی بات نہیں کرنی...... میرا مطلب ہے، اپنے طور پر جو ہم آپس میں بیٹی کے حصے کا حساب لگاتے ہوئے اس کو مکان بنوا کر دینے کے منصوبے بناتے رہے ہیں۔ اگر تمہارا بھانجا، شوہر کی حیثیت سے ہماری بیٹی کے ساتھ مخلص رہا تو وقت آنے پر وہ سب کریں گے جو ہم نے سوچ رکھا ہے۔ وہ بیٹی کا جائز حق ہے، کسی پر احسان نہیں ہوگا۔"

اُمید بر آئی۔ حاجی کے دل کی کلی کِھل گئی۔ سابقہ منگنی کے مقابلے میں زیادہ خوشی منائی۔ ہونے والے داماد، اُس کے والدین اور بہن بھائیوں کو تحفوں سے لاد دیا۔ جتنے میں چھوٹا موٹا بیاہ ہو جاتا ہے، اس سے زیادہ رقم منگنی پر خرچ کر دی۔ اشاروں کنائیوں میں خواہش ظاہر کی کہ براہِ راست شادی ہی ہو جائے تا کہ فرض ادا ہو، لیکن سالی صاحبہ نے سفید پوشی کا عُذر پیش کیا اور تیاری کے لیے سات آٹھ ماہ کی مہلت مانگ لی۔ اتفاق رائے سے طے ہو گیا کہ اسی سال دسمبر کی چھٹیوں میں خوشی منائیں گے۔

دسمبر ابھی دُور تھا کہ موسمِ گرما کی تعطیلات کے آغاز میں ہی حاجی مقبول الٰہی پر گویا بجلی گری۔ میاں بیوی شکرانے کے طور پر عمرہ کر کے گھر لوٹے تھے کہ بُری خبر سننے کو ملی۔ خالہ ان کی غیر موجودگی میں منگنی کی انگوٹھی لوٹا گئی تھی۔ روئی پیٹی اور ثمرہ کو بتایا کہ آصف نے یونیورسٹی کی کسی طالبہ سے نکاح کر لیا ہے۔ لڑکی کا باپ وفاقی حکومت کا کوئی ایڈیشنل سیکریٹری ہے۔ بیٹی اور داماد کو اسکالرشپ پر بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیج رہا ہے۔

سابقہ منگنی چھے ماہ تک چلی تھی، جب کہ موجودہ کے دو مہینے بھی پورے نہ ہوئے۔ حاجی صدمہ برداشت نہ کر پائے۔ ممکن ہے دل کا عارضہ پرانا ہو۔ کبھی ایسا موقع ہی نہ آیا کہ اس حوالے سے شُبہ ہوتا اور پوری طرح طبی معائنہ کروایا جاتا۔ ہر کسی نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اِس سانحہ پر اظہارِ خیال کیا۔ کوئی کہتا کہ موت کا وقت مقرر ہے۔ اسی طرح لکھی ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لو کہ یہ محض بہانہ بنا۔ دوسرا بولتا؛ نیک انسان تھے۔ اللہ کے گھر سے واپس

لوٹتے ہی بلاوا آ گیا، پیشتر اِس کے کہ دنیا داری کے جھمیلوں میں پڑتے۔ بعضوں نے یوں کہا کہ آج کل بیماریوں کا پتا ہی نہیں چلتا اور اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ کچھ ایسے بھی تھے، جنھوں نے بغیر لگی لپٹی کے بول دیا کہ باپ کو بیٹی کا غم مار گیا۔ غرضیکہ، جتنے منہ اتنی باتیں۔ البتہ ثمرہ کے دِل میں گرہ پڑ گئی کہ اپنوں کی خودغرضی اور بے وفائی اس کے باپ کی موت کا سبب بنی ہے۔

غم جتنا ہو، انسان کو زندگی کے معمولات کی طرف لوٹنا ہی پڑتا ہے۔ تعزیت کرنے والوں میں صرف خالہ کے گھر سے کوئی فرد شامل نہ ہوا تھا۔ بہت جلد یہ بات کھُل گئی کہ خالہ زاد نے محض منگنی توڑنے کی غرض سے نکاح کے بارے میں من گھڑت خبر اُڑائی تھی۔ معلوم ہوا کہ گرل فرینڈ کے ساتھ تعلقات منقطع ہو چکے ہیں اور وہ اکیلی اسکالرشپ پر یو ایس اے گئی ہے۔ ثمرہ کے ماموں نے اپنی بہن سے ایک مرتبہ پھر پرانا مطالبہ دہرایا لیکن غمزدہ عورت کوئی فیصلہ نہ کر پائی اور خاموش رہی۔ بیٹی ہر وقت کشیدہ خاطر رہنے لگی تھی۔ ذرا سی بھنک پا کر ماں سے کہہ دیا کہ باپ کا کفن ابھی میلا نہیں ہوا، لہٰذا اس موضوع پر بات کرنے کی بھی روادار نہیں۔

گھر کے تینوں افراد ماں بیٹی اور بیٹا ایک دوسرے کی دل جُوئی میں لگے رہتے تاکہ صدمے سے نکل پائیں۔ مرحوم نے ترکے میں اتنا کچھ چھوڑا تھا کہ چھوٹے سے کنبے کو اگلی کئی نسلوں تک فکرِ معاش لاحق نہ ہوتی۔ ماہانہ مستقل آمدن آ رہی تھی۔ ایک دوسرے کو بہلانے کی پوری کوشش کرتے لیکن گھر کی فضا سوگوار ہوئی رہتی۔ ماں کی دلی خواہش تھی کہ بیٹا یونیورسٹی کے مجوزہ مطالعاتی دورے پر جائے۔ اُس نے کئی بار انکار کیا کہ طبیعت مضمحل سی ہے۔ دل نہیں مان رہا۔ بہن نے بھی دباؤ ڈالا۔ ماں بیٹی کی مشترکہ کاوشوں کے نتیجے وہ گھر سے نکلا تھا۔ رات کے خبرنامے میں رُوح فرسا خبر نشر ہوئی کہ قومی شاہراہ پر یونیورسٹی کی بس تیز رفتاری کے باعث سامنے سے آنے والے ٹرالر سے ٹکرا گئی ہے۔ سات لڑکے موقع پر جاں بحق ہو گئے۔

باقی سارے ہی زخمی ہیں۔ پندرہ شدید زخمیوں میں سے آٹھ کی حالت تشویش ناک ہے۔
اگلے روز اڑھائی بجے کے قریب جوان بیٹے کا تابوت گھر میں آ گیا۔ دنیا اندھیر ہو گئی۔ علاقے بھر کے وہ لوگ بھی افسردہ ہو گئے، جن کی اس رستم رسیدہ گھرانے کے ساتھ رسمی سی راہ و ربط بھی نہ تھی۔ کیا اپنے کیا پرائے، جواں مرگ پر اُمڈ آئے۔ ماں اور بیٹی، دونوں ہی سکتے کی سی حالت میں تھیں۔ ثمرہ حواس باختہ سی ہوئی دیکھتی کہ تائی، پھوپھو اور خالہ پچھاڑیں کھا رہی ہیں۔ گویا تینوں، بین اور سینہ کوبی کرنے میں مقابلہ کر رہی ہوں۔ وہ جس کے ہتھے چڑھتی، سینے سے لپٹا کر جکڑ لی جاتی۔ رو رو کر مرنے والے کی خوبیاں گنوائی جائیں۔ بھانجی کو اگر خالہ نے دبوچ رکھا ہے تو جیٹھانی نے دیورانی کو بانہوں میں بھر لیا ہے اور پھوپھو اپنی باری لینے پر تُلی بیٹھی ہے۔
بیٹے کو باپ کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے چوتھا دن ڈھلنے کو آیا تو ثمرہ کا دماغ چکرانے لگا کہ تینوں خواتین ٹلنے کا نام نہیں لے رہیں۔ اِس دوران میں جو کوئی بھی اپنے گھر کو گئی تو جلد ہی واپس لوٹ آئی۔ ماں صدمے سے نڈھال ہوئی پڑی رہتی جب کہ خالہ پھوپھو اور تائی کے مابین جو غیر اعلانیہ مسابقت جاری تھی، رفتہ رفتہ یوں رنگ دکھانے لگی کہ ابتدا میں نوک جھوک ہوئی اور نوبت یہاں تک آئی کہ ایک دوسری پر حیلے بہانے غرّانے خوخیانے بھی لگ گئیں۔ ان میں کسی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دوسری دونوں کو بیک وقت اٹھا کر باہر پھینک دے۔ نجمہ ابھی عدت میں تھی اور ثمرہ اس کے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہتی۔
ثمرہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ تینوں بزرگ خواتین سے کہا کہ بہت ماتم پُرسی ہو گئی، اب اُنہیں اپنے اپنے گھر کی خبر لینی چاہیے۔ دُکھ کی اس گھڑی میں ساتھ دینے کا بہت شکریہ۔ ماموں نے سارے کام سنبھال رکھے ہیں۔ ہم ماں بیٹی کو ایک دوسری کے ساتھ وقت گزارنے کی مہلت درکار ہے۔

وہی تینوں خواتین، جو چند لمحے پہلے تک ایک دوسرے کو کینہ تُوز نظروں سے دیکھ رہی تھی، چونک گئیں۔ خالہ اور پھوپھو نے یوں نگاہیں جُھکا لیں گویا خجالت محسوس کی ہو لیکن تائی صاحبہ نے بھنّا کر کہا: ’دیکھو لڑکی! میں سیدھی کھری بات کرنے والی عورت ہوں۔ یہ جو تمہاری خالہ اور پھوپھو بیٹھی ہے چھاوَنی ڈالے، مجھے نہیں پتا کیوں؟ ہم سے جو تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی، اُس کا بڑا صدمہ ہے۔ مقبول الٰہی، اللہ اُس کا جنتوں میں ٹھکانا کرے ان شا اللہ، میرا سگے بھائی جیسا دیور۔ بیٹا ایکسی ڈینٹ کی خبر سن کر رہ نہ سکا۔ جہاز پکڑا اور آ گیا۔ بڑا پشیمان ہے کہ نیک چاچا کو دُکھ دیا۔ کہتا ہے، اللہ کو کیا جواب دوں گا۔ ازالہ کرنے آیا ہے۔‘‘

خالہ اور پھوپھو کچھ گڑ بڑا سی گئیں۔ ہونقوں کی طرح دیکھنے لگیں۔ کچھ سمجھ نہ پائیں کہ بولیں یا چُپ ہی رہیں۔ ثمرہ بول پڑی: ’’تائی جی! اس ہمدردی کا بہت شکریہ۔ بیٹے سے کہیں، اگلا جہاز پکڑے اور واپس چلا جائے۔ تایا پھوپھی خالہ، تینوں میں سے کسی زاد کی مہربانی نہیں چاہیے‘‘۔

پھوپھو سے صبر نہ ہوا اور ٹوک دیا: ’’ماموں جو اِس گھر کا کھڑ پینچ بنا بیٹھا ہے۔ اب اُسی کا زاد ہی چلے گا۔ وہ جو ڈرائیور ہے؟‘‘ تائی نے نند کو ٹوکتے ہوئے جھٹ سوال کر ڈالا تو ثمرہ نے تحمل سے جواب دیا: ’’ڈرائیور تو شاید نہ مانے، گلی کا سوپر مان جائے گا۔ بھائی کا چہلم ہو لے، بات کر کے دیکھ لیں گے۔ آپ لوگ بے فکر ہو کر جائیں۔‘‘

ارشد مرشد

تھپڑ

اگست کی گھمسیدہ رات کا پہلا پہر تھا۔ شہر کے اہم کاروباری مرکز میں واقع ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور کی دوسری منزل پر واقع وسیع اور پر آسائش دفتر میں سٹور کے نوجوان مالک میاں شاہد بشیر اور اس کے آسودہ حال یارانِ خاص کی محفل جمی تھی ۔ دن بھر کی بھاری مصروفیات کی تھکن کا بوجھ بلیک لیبل اور گرما گرم چانپوں کی مدد سے ہلکا کیا جا رہا تھا۔ ہفتے عشرے میں ایک آدھ بار لازم ان نیم دانشوروں کا اکٹھ اس جگہ یا کسی دوسرے دوست کے مہمان خانے میں ہو جاتا۔ آدابِ مے نوشی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یار لوگ چینل بدل بدل کر آٹھ سے نو بجے والے ٹاک شوز کو پورے انہماک سے سنتے ہوئے پیشہ ور میزبانوں اور تجزیہ نگاروں کی آرا کو اپنے اپنے ذہن کی پٹاری میں محفوظ کر رہے تھے کہ بعد ازاں ان مباحث میں اٹھائے جانے والے نقاط کو بطور دلیل پیش کر کے دیگر محافل میں اپنی علمیت کا رعب جھاڑ سکیں۔ دوسری جانب باہر کی چلچلاتی گرمی اور شدید حبس سے بے نیاز رنگ برنگے قیمتی سوٹ اور نک ٹائیاں زیبِ تن کیے لاکھوں روپے کا معاوضہ وصول کرنے والے میزبان گلا پھاڑ پھاڑ کر غریب عوام کی حالتِ زار اور وطنِ عزیز کی بدحالی کا رونا رو رہے تھے۔

دیوانِ خاص میں سجنے والی اس بزم میں گفتگو کی تان اکثر کاروباری اتار چڑھاؤ کو زیرِ بحث لانے کے بعد ملکی حالات پر آ کر ٹوٹتی۔ پاکستان کا کیا بنے گا؟ کیا یہ ملک قائم رہ پائے گا یا مسلسل بدنظمی اور لوٹ کھسوٹ کے ہاتھوں ایک روز اپنے وجود اور سلامتی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ وطن کی محبت میں کڑھنے والے اور شراب وشباب کی محفلوں میں ایک رات میں لاکھوں روپے لٹانے والے ان متمول دوستوں میں شاید ہی کوئی حکومتِ وقت کو چند ہزار روپے بھی بطور ٹیکس ادا کرنا گوارہ کرتا ہو۔ جونہی جانی واکر نے جان وجگر کو منور کیا تو پھر سے پاکستان کی

زبوں حالی ان کے دل و دماغ کے تاروں کو چھیڑنے لگی۔ لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد تقریباً سبھی حاضرین کسی متفق علیہ حدیث کی طرح اس نقطے پر متفق اور یک زبان تھے کہ پاکستان کے تمام تر مسائل کا موجب دوشیزۂ جمہوریت کی افواجِ پاکستان کے ہاتھوں بار بار کی عصمت دری کے علاوہ کچھ اور نہیں اور یہ کہ فوج اپنی حاکمیت اور بالا دستی قائم رکھنے کی خاطر دیگر اداروں کو پنپنے اور سول حکمرانوں کو اپنا اختیار استعمال کرنے کا موقع فراہم نہیں کرتی۔

وسیع اور عالی شان دفتر کی بغلی دیوار پر نصب سکرین پر وقفے وقفے سے سٹور کے بدلتے ہوئے بیرونی اور اندرونی مناظر کلوز سرکٹ کیمروں کی مدد سے مسلسل نمودار ہو رہے تھے۔ خمارِ مے اور ثقیل گفتگو کے باوجود میاں شاہد بشیر چند ساعتوں کے لیے سکرین پر سرسری نگاہ ڈال کر دوبارہ پاکستان کی بگڑی تقدیر سنوارنے میں لگ جاتا۔ گرما گرم بحث کے دوران اچانک محفل کے قدرے عمر رسیدہ اور عاشق مزاج دوست کے اٹھے ہاتھ کے عقب میں تمام قومی اور بین الاقوامی امور کے ماہرین کی توجہ یکلخت پاکستان کے مسائل سے ہٹ کر سکرین پر مبذول ہو گئی۔ کاؤنٹر پر نصب کیمرہ خریداری کے بعد بل کی ادائیگی کے لیے کھڑی ایک نہایت حسین اور پروقار خاتون پر فوکس تھا۔ دوستوں کے پرزور اصرار پر میاں صاحب نے ریموٹ کی مدد سے خاتون کو کلوز اپ میں لے لیا۔ مناسب قد و قامت، سفید اور سندوری رنگت، بادامی آنکھوں اور کتابی چہرے پر بکھری ہوئی دیوداسیوں جیسی پاکیزگی اور اداسی خاتون کے چہرے پر کیمرے کی آنکھ سے بھی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ سیاہ رنگ کے دوپٹے سے بار بار باہر جھانکتی ہوئی لٹ پیچھے کرتے ہوئے اس نے بل ادا کیا اور ایک کونے میں شاپنگ بیگ کھول کر خریدے گئے سامان پر نظریں گاڑھ کر ساکت کھڑی ہو گئی۔ ٹھرکی کلانچیں بھرتا ہوا سیڑھیاں اترا اور کونے میں مبہوت کھڑی اس عورت کو بغور دیکھنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے شیشے کے پیچھے سجے تمام عطریات اور خوشبوجات آفریں

آفریں کی دھن پر اس کے گرد محوِ رقص ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہانپتا کانپتا واپس لوٹا تو دوستوں کی استفہامیہ نظروں کو بھانپتے ہوئے بولا" چلی گئی یار۔ آلٹو خود چلا کر اکیلی آئی تھی۔ عجیب سے وحشت ٹپک رہی تھی اس کی آنکھوں سے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی زخم خوردہ ہرنی ہو۔ سچ پوچھو تو پاس سے دیکھ کر مجھے فیض احمد فیض کا شعر یاد آ گیا:

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

اگلے ماہ کی غالباً اسی تاریخ کو وہ دوبارہ آئی اور نیند میں چلنے والے مریض کی طرح ڈولتے ہوئے مختلف ریکس سے مطلوبہ اشیا اکھٹی کرنے لگی۔ میاں شاہد نے نیچے اتر کر قریب سے دیکھا تو اس کے سپاٹ اور بے تاثر چہرے پر گہری سنجیدگی کی تہہ کے علاوہ اور کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کے جانے کے بعد شاہد نے تجسس کی پیاس بجھانے کے لیے کیش کلرک سے خاتون کے بل کی نقل لے کر پڑھی تو شیونگ کریم، ٹوتھ پیسٹ، آفٹر شیو لوشن، رومال، بنیان ، انڈر ویئر جیسی مردانہ استعمال کی اشیا کے ساتھ ایک عدد ڈریس پینٹ اور میچنگ شرٹ کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر چیز نہیں تھی۔ وہ ہر ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں آتی اور خریداری کر کے چپ چاپ لوٹ جاتی۔ یہ سلسلہ اگلے تین چار ماہ تک جاری رہا۔ اور پھر اس نے آنا ترک کر دیا۔ خریداروں کی بھیڑ میں ایک شخص کے آنے یا نہ آنے سے کیا فرق پڑنا تھا البتہ شاہد کے دماغ کے کسی گوشے میں اس غیر معمولی خاتون کو جاننے کا تجسس ابھی موجود تھا۔

اس دن ویلن ٹائن ڈے تھا۔ ہر خاص و عام اپنی حیثیت اور تعلق کی نوعیت کے مطابق دن کی مناسبت سے اپنے حصے کی خوشیاں کشید کرنے میں مگن تھا۔ مختلف اقسام کے جا بجا بکتے ہوئے دلوں اور سرخ گلابوں کی بہتات نے بازار کی رونق کو دوبالا کر دیا تھا۔ آج پھر دیوانِ خاص میں محفل جمی ہوئی تھی۔ لیکن تعداد قدرے کم تھی شائد کچھ منچلے دن کی مناسبت سے دل لگی میں مصروف تھے۔ ابتدا میں طعام اور شراب نوشی کے دوران اس مخصوص دن

کے حوالے سے مختلف آرا کا اظہار کیا گیا۔ او چند علما کرام کی جانب سے ویلن ٹائن ڈے کو حرام قرار دیے جانے پر ہرزہ سرائی ہوئی اور پھر حسب معمول گفتگو کا سلسلہ حالاتِ حاظرہ سے ہوتا ہوا مسلح افواج کی کج ادائیوں کی جانب مڑ گیا۔ شاہد کی نگاہ اچانک کیمرہ سکرین پر پڑی تو ایک سن رسیدہ اور باوقار خاتون جس کے سر میں وقت کی چاندی بھر چکی تھی نہایت دھیمے اور مہذب انداز میں کیشئر کے ساتھ مصروفِ گفتگو دکھائی دی۔ کیشئر کی حرکات وسکنات اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بیزارگی اور ناگواری صاف عیاں تھی۔ اس ادھیڑ عمر خاتون کے عقب میں ایک ملازم لڑکا ہاتھوں میں چند شاپنگ بیگ اٹھائے کھڑا تھا۔ اور پاس ہی وہ پراسرار خاتون چپ سادھے کھڑی بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کا ناخن چبا رہی تھی۔ معاملے کی نوعیت جاننے کے لیے وہ لمبے ڈگ بھرتا فوراً کاؤنٹر پر پہنچا۔ استفسار کرنے پر بڑھیا کیشئر کے جواب دینے سے پہلے ہی اس سحر زدہ لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی" بیٹا! یہ میری بہو ہے۔ میرا اکلوتا بیٹا فوج میں میجر تھا۔ گزشتہ سال وہ وانا میں دہشت گردوں کے ساتھ جواں مردی سے دادِ شجاعت دیتا ہوا اِس مٹی پر قربان ہو گیا۔ اور یہ اپنے دل وجان سے پیار کرنے والے جیون ساتھی کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر پائی اور ہوش وحواس کی دنیا سے دور چلی گئی۔ اور آج بھی اس امید کے سہارے جی رہی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور لوٹ آئے گا۔ حوصلہ مند بزرگ خاتون چند لمحے جذبات پر بند باندھنے کے لیے رکی اور پھر کانپتی ہوئی آواز میں سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ بیٹا یہ سامان واپس لے کر ہماری رقم لوٹا دو اور اگر یہ ممکن نہیں تو بدلے میں ضرورت کا کوئی اور سامان دے دو۔ آپ کے منیجر صاحب تعاون کرنے کو تیار نہیں اور بار بار دیوار پر چسپاں نوٹس پر لکھی تحریر کا حوالہ دے رہے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوتا۔ اور یہی بات میں اپنی اس پگلی بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں مگر یہ نادان کسی طور سمجھنے پر

آمادہ نہیں۔ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے صاف لگ رہا تھا کہ کوئی چیز اس کے گلے میں اٹک رہی ہے۔ شاہد کا سارا وجود رعشے کے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ لفظ ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اشارے سے اکاؤنٹنٹ کو پیسے واپس کرنے کا کہہ کے کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ عظیم اور بہادر عورت اس قریب آئی تو وہ تمام تر حواس جمع کرتے ہوئے بولا" ماں جی میرے لیے کبھی کوئی حکم ہوا تو ضرور بتایئے گا"۔

" بیٹا خدا تمھیں ہمیشہ خوش رکھے۔ بس اتنا کرنا کہ اگر کسی کو اپنے وطن اور فوج کو برا بھلا کہتے سنو تو ان سے بس اتنا کہہ دینا کہ آزادی کے بدلے جگر کے ٹکڑے قربان کرنا پڑتے ہیں اور ساتھ یہ بھی بتانا کہ جوان بیٹوں کی لاشیں بہت بھاری ہوتی ہیں۔ انگ انگ توڑ کے رکھ دیتی ہیں۔ اس بڑھیا نے بڑھ کر شاہد کے داہنے رخسار پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بوجھل قدموں سے باہر کو چل دی۔ اس کے جانے کے بعد دیر تک شاہد اپنے گال کو یوں سہلاتا رہا جیسے بڑھیا نے شفقت بھرا ہاتھ نہیں اس کے گال پر زوردار تھپڑ جڑ دیا ہو۔

کنول بہزاد

نانا کی لڑکی

سکول سے چاند فرلانگ پہلے تانگا ایک تنگ سی گلی میں مڑنے لگا تو شکیلا نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر سوالیہ نظروں سے زینب کو دیکھا غیر حاضری کے باعث وہ نئی سواری سے لاعلم تھی۔

" دسویں جماعت کی ایک باجی یہاں سے جاتی ہیں"۔ زینب نے اس کی آنکھوں کا سوال بخوبی سمجھ کر جواب دیا اتنے قریب سے یہ تو پیدل جانے کا راستہ ہے۔ وہ حیرانی سے بولی۔ اس بار زینب نے محض کندھے اچکانے پر اتفاق کیا۔" نانا کی لڑکی او نانا کی لڑکی" کوچوان نیچے اتر کر ایک سال خوردا دروازے کے سامنے کھڑا ہانک لگا رہا تھا۔" یہ نانا کی لڑکی کیا ہوتا ہے"۔ شکیلا کے لیے چپکی بیٹھنا دوبھر تھا۔" شش وہ آ گئی ہیں"۔ زینب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا سر سے پاؤں تک سیاہ برقے میں ملبوس وہ سج سج قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی اور پیچھے ایک اَسی نوے سالا بزرگ لاٹھی ٹیک ٹیک کر چلے آ رہے تھے۔ تانگے کے قریب پہنچ کو اس نے پائیدان پر پاؤں رکھا اور ہاتھ شکیلا کی طرف بڑھایا۔ شاید اسے سوار ہونے کے لیے مدد درکار تھی۔ شکیلا نے اس کا ہاتھ تھاما تو یوں لگا روئی کا نرم گالا اس کی مٹھی میں آ گیا ہے۔ مومی انگلیوں والا وہ ہاتھ کالے برقے کی آستین میں سے اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ شکیلا نے اپنے سانولے ہاتھ سے موازنہ کیا تو جھینپ کر ہاتھ چھڑا لیا۔ شکر ہے وہ گری نہیں البتہ سیاہ نقاب سے جھانکتی خوبصورت آنکھوں میں حیرانی ضرور تھی۔ ساتھ ہی بزرگ کی آواز سنائی دی۔" دھیان سے بٹیا"۔ وہ شکیلا اور زینب کے ساتھ پچھلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ شکیلا اب مرعوبیت سے چپکی ہو کر بیٹھی تھی۔ زینب اس کی غیر معمولی خاموشی پر حیران تھی۔ تانگہ سکول کے سامنے رکا تو لڑکیاں ایک ایک کر کے اتر گئیں۔ شکیلا نانا کی لڑکی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ بالآخر اس کی دلی مراد بر آئی، جب اس

نے گیٹ پار کر کے چہرے سے نقاب الٹ دیا۔شکیلا کو لگا واقعی بدلی سے چاند نکل آیا ہے۔کوئی لڑکی سچ مچ اتنی خوبصورت بھی ہوسکتی ہے۔شکیلا نے دانتوں میں انگلی دبا کر سوچا۔ اسے ہوش تب آیا جب زینب نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ "اوہو! کیا ہوگیا"۔وہ چڑ کر بولی" تم مجھے پیچھے چھوڑ کر بھاگ کیوں آئی۔میرا بستہ نیچے گر گیا تھا۔سب کچھ اکیلے سمیٹتی رہی۔آج ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی کیا"۔زینب نے شکوہ کیا۔ " میں ناوہ نانا کی لڑکی کو دیکھنا چاہتی تھی۔اللہ کتنی پیاری ہیں۔ہاں سچ! پیاری تو بہت ہیں"۔ زینب پوری طرح متفق تھی ۔اسمبلی کی گھنٹی بجی تو دونوں تیز تیز چلنے لگیں۔آدھی چھٹی کے وقت چنا چاٹ پر ڈھیر ساری املی کی چٹنی ڈال کر کھاتے ہوئے بھی وہ دونوں نانا کی لڑکی کی ہی باتیں کرتی رہیں۔میٹرک والوں کا بلاک الگ تھا اور یہ دونوں مڈل میں تھیں ۔وہاں بلاوجہ جانے کی اجازت نہیں تھی ورنہ شکیلا تو ضرور دو چار چکر لگاتی۔چھٹی کے وقت دونوں ہی پچھلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئیں ۔خوشنودہ ان کے ساتھ بیٹھنے لگی تو دونوں نے اس کی خوشامد کر کے آگے بھیج دیا۔آخر میں نانا کی لڑکی آہستہ روی سے چلتی ہوئی آئی اور ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔کوچوان نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر پوچھا:" نانا کی لڑکی آ گئی"۔" جی!" دونوں نے بہ یک وقت کہا اور تانگہ چل پڑا۔واپسی پر سب سے پہلے نانا کی لڑکی باری آتی تھی۔تانگہ گلی کی نکڑ پر پہنچا تو صبح والے بزرگ گلی میں بے چینی سے ٹہلتے نظر آئے۔تانگے پر نظر پڑتے ہی وہ اس کی طرف لپکے۔" اتنی دیر کیوں لگا دی۔چھٹی ہوئی تو کافی وقت ہوگیا"۔تانگے کے قریب آ کر وہ ہانپتے ہوئے بولے۔ بزرگو! بچیاں دیر لگا دیتی ہیں نکلتے نکلتے"۔کوچوان نے جواب دیا۔آج کل سکول میں بڑی چہل پہل تھی مینا بازار کے دن جو قریب آ رہے تھے۔ سب لڑکیوں کی خوشی دیدنی تھی اور تیاریاں بھی عروج پر تھیں۔تانگے میں بھی بس چوڑیوں ،کپڑوں، پازیبوں اور جھمکوں کی ہی باتیں ہوتیں۔البتہ نانا کی لڑکی چپ سادھے بیٹھی رہتی

شکیلہ اور زینب بھی جیسے اپنی تیاریوں میں اسے بھول چکی تھیں۔ بزرگ کا وہی معمول تھا۔ صبح اسے تانگے میں سوار کراتے، کوچوان کو تاکید کرتے اور واپسی پر گلی میں منتظر ملتے۔ مینا بازار میں ایک ہی دن باقی تھا کہ نانا کی لڑکی کی چھٹی کی درخواست آ گئی۔ وہ بیمار تھی۔ شکیلا کو بڑا افسوس ہوا۔

"لگتا ہے مینا بازار میں نہیں آ پائیں گی"۔

"ہاں شاید"۔ زینب بولی۔

صبح مینا بازار تھا شکیلا کو ساری رات خوشی کے مارے نیند نہ آئی۔ تانگے کی آمد پر وہ اونچی ایڑھی والا جوتا پہنے گلی میں نکلی تو محسوس ہوا آج دنیا نئی ہے۔ سر سے پھسلتے دوپٹے کو نزاکت سے سنبھالا۔ دوسرے ہاتھ سے کان میں پڑے جھمکے کو چھوا، مبادا گر گیا ہو۔ ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ بھی کتنی دل آویز لگتی ہے۔ اسے معمول کا بھدا سوتی یونیفارم یاد آیا تو سوچا۔

آج تو تانگے میں پھولوں کا گلدستہ سوار تھا۔ سب خواہ مخواہ ہی ہنسے جا رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے کپڑے اور زیور چھو کر دیکھ رہی تھی۔ پتا ہی نہ چلا کہ تانگہ کب مخصوص گلی میں آخری سواری کو لینے کے لیے رک گیا۔ خلاف توقع نانا کی لڑکی بڑی تمکنت سے چلتی تانگے کی طرف بڑھی۔ پیچھے بزرگ بھی چلے آ رہے تھے۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑ بڑا رہے تھے۔ مگر سمجھ نہ آیا کہ کیا کہہ رہے تھے۔ شکیلا تو آج جیسے اپنے آپ میں ہی نہ تھی۔ ایک نگاہِ غلط انداز میں اُس طرف نہ ڈالی۔ تانگہ سکول کے پاس رکا تو شکیلا نے بڑی ادا سے پرس کندھے سے لٹکایا اور زینب کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ دونوں اندر پہنچیں تو محسوس ہوا رنگ ونور کا سیلاب امڈ آیا ہے۔ نانا کی لڑکی ان کے دائیں طرف ساتھ ساتھ ہی چل رہی تھی۔ آج اس نے خلاف معمول وہیں چلتے چلتے تیزی سے برقعہ اتارا۔ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے سیلاب تھم گیا ہو۔ سفید غرارہ سوٹ میں، ماتھے میں نقرئی بندیا لگائے جیسے کوئی اپسرا زمین

پر اتر آئی تھی۔ آس پاس موجود لڑکیاں اسے مڑ مڑ کر دیکھنے لگیں۔ شکیلا کا دل کیا کہ اپنا ہار، بندی، پازیب، چوڑیاں سب نوچ کر پھینک دے۔ کتنا ڈھیر سارا وقت لگایا تھا اس نے تیاری میں، ساری محنت اکارت چلی گئی تھی۔ جب نانا کی لڑکی آہستہ آہستہ چلتی بھیڑ میں گم ہو گئی تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔

کافی عرصے بعد ایک دن آدھی چھٹی کے وقت شکیلا نے زینب سے کہا" کل میں بھائی کے ساتھ بازار گئی تھی پتا ہے وہاں میں نے کیا دیکھا" ؟

" کیا دیکھا" ؟ زینب سے اشتیاق سے پوچھا۔

" خریداری کے بعد میں نے بھائی سے فرمائش کی کہ مجھے فروٹ چاٹ کھلائیں۔ ہم دکان کے اندر گئے تو ایک کیبن میں نانا کی لڑکی بھی اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی" ۔

" تمہیں کیسے پتا کہ وہ اس کا بھائی تھا" ؟ زینب نے جرح کی۔

" میں بھی تو بھائی کے ساتھ گئی تھی" ۔ شکیلا نے جھٹ جواب دیا۔

زینب کچھ کہنے لگی تھی کہ آدھی چھٹی ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی اور بات ادھوری رہ گئی۔ شہر میں ہڑتال کی وجہ سے سکول کچھ روز کے لیے بند ہو گیا۔ چھٹیوں کے بعد تانگہ حسب سابق نانا کی لڑکی کو لینے پہنچا تو بار بار ہانک لگانے پر بھی کوئی باہر نہ آیا۔ کافی دیر بعد اندر سے کوئی نسوانی آواز آئی تو کوچوان سست قدموں میں واپس آ کر تانگے پر بیٹھ گیا۔

" کیا ہوا بابا" ؟ ساری لڑکیوں نے یک وقت پوچھا۔

" وہ نانا کی لڑکی تھی نا! مر گئی بے چاری" ۔ کوچوان نے دکھ بھرے انداز میں جواب دیا

" کیا" ! ساری لڑکیاں جیسے ایک دم چیخیں۔

" بس اللہ کی مرضی" ۔ کوچوان آہ بھر کر بولا شکیلا تو باقاعدہ سسکیوں سے رونے لگی۔ باقی

لڑکیاں بھی آنسو پونچھ رہی تھیں۔آخر کئی مہینوں کا ساتھ تھا۔اُس دن آدھی چھٹی کے وقت زینب اور شکیلا یہی پروگرام بناتی رہیں کہ نانا کی لڑکی کے گھر افسوس کے لیے ضرور جانا چاہیے۔مگر سکول سے تو جا نہیں سکتی تھیں۔گھر آ کر شکیلا نے تو ضد پکڑ لی کہ اس نے ضرور افسوس کے لیے جانا ہے۔ آخر اماں مان گئیں اور بڑے بھائی آفتاب کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔راستے سے زینب کو ساتھ لے کر وہ تانگے پر روانہ ہوئے۔وہاں پہنچے تو دستک دینے پر ایک بے حد کمزور اور منحنی سی عورت نے دروازہ کھولا اور آنے کی وجہ پوچھی۔زینب اور شکیلا نے مدعا بیان کیا تو وہ عورت جیسے کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔پھر باریک سی آواز میں بولی:" آجاؤ"۔

اندر داخل ہوتے ہی انھیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی تنگ و تاریک غار میں آ گئی ہوں۔نہ کوئی کھڑکی نہ روزن۔کتنی دیر بعد دونوں کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں۔سیلن زدہ دیواروں کی ناگوار بو نے سارے ماحول کو گرفت میں لے رکھا تھا۔تازہ ہوا کے جھونکے اس گھر سے ناراض لگتے تھے۔پورے ماحول پر عجیب سی یاسیت اور سکوت طاری تھا۔عورت انھیں چارپائی پر بٹھا کر خود کونے میں پڑے ایک موڑھے پر ٹک گئی اور خالی خالی نظروں سے انھیں دیکھنے لگی۔شکیلا کو اس سارے ماحول سے وحشت سی ہونے لگی۔یہی حال زینب کا تھا۔دونوں کو جیسے چپ سی لگ گئی ہو۔سمجھ میں نہ آیا کہ سامنے بیٹھی عورت سے وہ کن الفاظ میں افسوس کا اظہار کریں۔اتنے میں وہ بزرگ کسی اندھیرے میں ہیولے کی مانند نمودار ہوئے ۔ عورت نے آہستہ آواز میں کچھ کہا تو وہ جیسے پھٹ پڑے:" وہ مر گئی تو مر گئی۔تم اب کیا لینے آئی ہو؟ کتنا ساتھ تھا تمہارا اور اس کا؟ مجھ سے پوچھو مجھ سے۔اِتی سی تھی جب باپ کے مرنے کے بعد میری گود میں آئی تھی۔کیسے پالا میں نے اسے کیسے پالا۔یہ میں ہی جانتا ہوں ۔ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا۔زمانے کی گرم ہوا نہیں لگنے دی۔اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ تڑپ جاتا تھا۔یہ بیٹھی ہے نا! اس کی ماں، اِس سے پوچھو سچ کہہ رہا ہوں نا! اسے مڈل تک

گھر میں پڑھاتا رہا۔ پڑھا لکھا ہوں میں۔ تقسیم سے پہلے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا میں نے۔ پھر اس کی ضد پر سکول میں ڈال دیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا میں۔ میں نہیں بھیجنا چاہتا تھا اُسے چار دیواری سے باہر۔ ڈرتا تھا میرا ڈر پورا ہو گیا۔ باہر کی دنیا کھا گئی اسے۔ کھا گئی اسے باہر کی دنیا"۔ یونہی بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر چلے گئے۔
عورت اب سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ شکیلا اور زینب وحشت زدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور باہر کو دوڑیں۔ مگر دروازے پر آفتاب کے ساتھ کوئی آدمی کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ اُس آدمی نے سر سے پاؤں تک دونوں کو دیکھا اور آفتاب سے مخاطب ہوا" اچھا چلتا ہوں بڑے میاں تو اندر منہ چھپا کر ہی بیٹھ گئے۔ ہمیں اشارہ کریں تو لڑکی کو پاتال سے بھی نکال لائیں گے۔ آخر ہمسائیوں کے بھی حقوق ہوتے ہیں"۔ مونچھوں کو بل دیتے ہوئے اس نے جاتے جاتے پھر دونوں پر نگاہ ڈالی۔ وہ اپنے آپ پر سمٹ کر رہ گئیں۔
" چلو گھر اب۔۔۔۔۔" آفتاب جانے کیوں انھیں دیکھ کر غصے سے بولا۔" بے وقوف لڑکیاں بغیر سوچے سمجھے گھر سے نکل پڑتی ہیں"۔ شکیلا جس کے ذہن میں ڈھیر سارے سوالات کلبلا رہے تھے ہمت کر کے بولی"
" کیا ہو بھائی ! خیریت تو ہے"؟ تیز تیز قدموں سے چلتے آفتاب نے کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

فاطمہ شیروانی

کنواں

سانوری کو بستی میں موجود اس اکلوتے کنویں سے بہت وحشت محسوس ہوتی تھی۔ حالانکہ کنویں کو تو بستی والوں نے مسیحا کا نام دے رکھا تھا۔ کنویں کے پانی سے نہ صرف وہ خود سیراب ہوتے تھے بلکہ اکثر اپنے مسئلے مسائل بھی اسی کے قدموں میں بیٹھ کر حل کر لیا کرتے تھے۔ مگر اب سانوری کو کون سمجھاتا جو اس کنویں کے سائے سے بھی پناہ مانگتی تھی۔ اس کنویں نے بچپن میں ایک بار اُس کی سہیلی کو نگل لیا تھا اور پھر کنویں کے بارے میں وہ ڈھیروں عجیب وغریب قصے سُن چکی تھی جس کے باعث یہ کنواں اب اُس کے لیے ایک خوف کی علامت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اب یہ اُس کی مجبوری تھی کہ منہ اندھیرے سورج کی آمد سے قبل اُسے بستی کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ اسی کنویں پر پانی بھرنے جانا پڑتا تھا۔ یہ تمام لڑکیاں اپنے دن بھر کے خواب، خواہشیں، رنگ اور شرارتیں اسی کنویں کے کنارے بیٹھ کر آپس میں بانٹ لیا کرتی تھیں۔ پانی بھرنا تو محض ایک بہانہ تھا اور پھر کنویں کے قُرب وجوار میں موجود لہلہاتی فصلوں میں عشق ومحبت کی کچھ بے چین داستانوں کو بھی پناہ مل جایا کرتی تھی۔ سانوری ان داستانوں کے تمام کرداروں سے واقف تھی۔ اُسے لگتا تھا کہ ایک روز یہ کنواں ان تمام کرداروں کو بھی نگل لے گا۔ وہ خود بھی اٹھارہ سال کی ہونے کو آئی تھی۔ اس عمر میں تو رنگوں سے بھرے خواب سرِشام ہی آنکھوں کے راستے دل پر دستک دینے لگتے ہیں۔ اس عمر میں تو رت جگوں کا خمار محض چند ہی ملاقاتوں کے بعد پورے وجود پر طاری ہو جاتا ہے۔ کوئی اجنبی اگر ہنس کر بات کر لے تو شہرِ دل کتنی ہی دلفریب خوشبوؤں سے مہکنے لگتا ہے۔ مگر سانوری کا دل ایسی کسی بھی مہک سے ناآشنا تھا۔ وہ تو اپنی دنیا میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ وہ حکیم خدا بخش کی آنکھوں کا

نور تھی۔ بہت منتوں مُرادوں کے بعد خدا نے حکیم خدا بخش کے آنگن میں یہ نور اُتارا تھا۔ زبیدہ اور حکیم خدا بخش تو اُسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ سانوری کی کنویں کے متعلق بے سروپا باتیں سُن کر اکثر اوقات حکیم صاحب ہنس دیا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان من گھڑت قصوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بہت سالوں پہلے بستی میں بارشوں کی کمی کی وجہ سے قحط جیسے حالات پیدا ہونے لگے تھے۔ گاؤں والوں کی فصلیں سوکھنے لگی تھیں۔ ایسے میں جب تمام کنویں خُشک ہو رہے تھے یہ واحد کنواں تھا جو ان دنوں میں بھی خُشک نہیں ہوا تھا۔ ہندوؤں کو لگتا تھا کہ کنویں کے اندر کوئی دیوی بیٹھی منتر پڑھ رہی ہے جبکہ مسلمانوں کو یقین تھا کہ کنویں کا انتظام کسی نیک دل فرشتے کے ہاتھ میں ہے جو کنویں کو کبھی خُشک ہونے نہیں دیتا تھا۔ دیگر علاقوں کی نسبت یہ بستی خاصی پسماندہ تھی۔ یہاں گنتی کے چند درخت، چند کچے پکے مکانات، ایک مندر۔ سرسوں کے میلوں تک پھیلے کھیتوں اور ایک کنویں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مسلمانوں کی نسبت یہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر سب آپس میں مل جُل کر رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے قہقہوں اور آنسوؤں میں شریک ہوتے تھے۔ حکیم صاحب کی بستی میں بڑی عزت تھی۔ کیا ہندو، کیا سکھ، عیسائی سب اُن کے پاس ہی دوا لینے آتے تھے۔ سب کو اُن سے شفاء ملتی تھی۔ کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ یہ مختلف مذاہب کے لوگ ہیں۔ سب ہر معاملے میں بہت تعاون کرتے تھے۔ گاؤں کی مُسکراتی فضا میں پہلا آنسو تب گرا جب گاؤں کے اکلوتے کنویں سے پہلی مسلمان لڑکی صائمہ کی لاش ملی۔ صائمہ کی موت کے بعد بستی کے لوگوں کے دلوں میں خوف ڈیرے ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بستی والے جو ایک دوسرے پر جان چھڑکنے کے دعویٰ کرتے تھے اب ایک دوسرے سے گریز برتنے لگے تھے۔ بستی کے در و دیوار خوف، وحشت، نفرت اور سنگدلی کے باعث لرزنے لگے تھے۔ وہ موتی لال جو حکیم صاحب سے دعائیں لیے بغیر اپنے کام پر نہیں جاتا تھا اب اُن سے ملنے سے کترانے لگا تھا۔ ہندو مسلم

بھائی بھائی کا تصور اب دم توڑنے لگا تھا۔ صائمہ کی اندوہناک موت کے سارے کُھرے ایک با اثر ہندو کے گھر کی طرف جاتے تھے مگر اُس پر ہاتھ ڈالنے کی جرات کسی میں نہیں تھی۔ مسلمان چونکہ اقلیت میں تھے اس لیے انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ اس معاملے پر خاموشی ہی اختیار کی جائے۔ چند جوشیلے مسلمان نوجوانوں نے اس با اثر ہندو کے گھر پر پتھراؤ بھی کیا مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہے، سو چند روز بعد حالات معمول پر آنے لگے مگر نفرت کی جو گرہ دلوں میں ڈھل چکی تھی اُسے کھلنے میں برسوں لگ جانے تھے۔ آزادی کے نعرے کی گونج اب اس بستی میں بھی سُنائی دینے لگی تھی۔ مسلمانوں کے لیے اب یہ زمین تنگ پڑنے لگی تھی بلکہ یوں لگتا تھا کہ جیسے مسلمان پر کسی آسیب کا سایہ پڑ گیا ہو۔ وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گئے تھے۔ ایسے وقت میں جب تمام ہندو مسلمانوں کے سائے سے بھی دور بھاگنے لگے تھے۔ ایک ہندو نوجوان ایسا بھی تھا جو ایک مسلمان لڑکی کے قرب کا متمنی تھا۔ سانوری کے قرب کی خواہش اب راج کا جنون بنتی جا رہی تھی۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ بستی میں رہنے والے مسلمانوں کو احساس ہو چُکا تھا کہ یہ بستی اب مسلمانوں کے رہنے کے قابل نہیں رہی۔ اُن کے لئے یہی بہتر تھا کہ وہ جلد از جلد اس بستی سے نکل جائیں۔ پاکستان کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی حکیم صاحب کی تقلید میں بستی کے دیگر مسلمانوں نے اپنا سامان باندھا اور پاکستان روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے حملوں کے پیش نظر یہی فیصلہ ہوا تھا کہ آدھی رات کو خفیہ طور پر نکلا جائے۔ اُدھر مسلمان باہر نکلنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اُدھر بستی کے اکلوتے کنویں نے مسلمانوں کے اُجڑنے کے غم میں ابھی سے آنسو بہانے شروع کر دیے تھے۔ چاند اپنے جوبن پر تھا مگر اُس روز چاند کی روشنی کے سارے رنگ ڈرے سہمے نظر آ رہے تھے۔ یہ روشنی اپنے ساتھ زندگی نہیں بلکہ درد اور اذیت لے کر آئی تھی۔ چاند کے ساتھ کھڑے تاروں نے

بھی خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں ۔ وہ آنے والی قیامت دیکھنا نہیں چاہتے تھے ۔ قیامت نے اس بار سانوری کے گھر پر دستک دی تھی ۔بستی کے تمام مسلمان حکیم صاحب کے گھر پر جمع تھے ۔ ابھی یہ بحث ہو رہی تھی کہ عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر نکلا جائے یا کچھ دنوں بعد حالات بہتر ہونے پر اُنہیں نکالا جائے ۔اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں آنے لگیں ۔گھوڑوں پر موجود چند شیطانوں نے حکیم صاحب کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔راج بھی انہی شیطانوں میں شامل تھا۔اُن کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور یہ مسلمانوں کے لہو سے اپنی مانگ سجانے کو تیار تھے۔مسلمانوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی ۔ فضا میں وحشت کا رقص اپنے جوبن پر تھا۔زمین جو نجانے کب سے پیاسی تھی مسلمانوں کے لہو سے اُس کی پیاس بجھنے لگی ۔مسلمان لڑکیاں اپنی عزتیں بچانے کے لیے کسی مسیحا کی تلاش میں بھاگ رہی تھیں مگر وہ مسیحا اُنہیں نہیں مل رہا تھا۔سانوری بھی اُنہی لڑکیوں میں شامل تھی جن کے لیے اُس لمحے اپنی عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔سانوری کا دوپٹا زمین پر گر چکا تھا ۔سانوری کو پکڑنے کو راج بیتاب تھا۔وہ بس ایک بار اُسے چھو کر اپنی ہوس کی تکمیل کرنا چاہتا تھا جسے اس نے محبت کا نام دے رکھا تھا۔سانوری کے دونوں پاؤں بہت بُری طرح زخمی ہو چکے تھے۔اس کا پور پور زخموں سے چُور تھا۔راج اُس کے بہت قریب پہنچ چُکا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ مکمل طور پر راج کی گرفت میں آجاتی ۔اُس کا مسیحا اُس کے سامنے آگیا۔سانوری کو اُس لمحے اپنے مسیحا پر بڑا پیار آیا۔وہ سارا خوف سانوری کے وجود کے ساتھ ہی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔بس چند لمحے ہی لگے اور سانوری سمیت تمام لڑکیوں نے خود کو کنویں کے حوالے کر دیا اور ہمیشہ کے لئے اس کنویں کی مسافر بن گئیں ۔

صفیہ انور صفی

عجیب لڑکی

اماں! میں ایسی کیوں ہوں؟

"میرے رب! میرے وجود کو بنانے میں...

تیرے خزانے میں کیا کمی رہ گئی تھی۔"

"اری نامراد! کیوں اتنا غم کھاتی ہے...شکر کر اس نے جیسا بھی بنایا..."

طعنے سن سن کر رجو جوان ہو چکی تھی

شیشے کے سامنے کھڑی سر سے پاؤں تک اپنا خوب جائزہ لیتی یہ معصوم سی لڑکی ان گنت خیالات میں گم ہو جاتی۔

"اماں! میں تو گاڑی والے کے ساتھ بیاہ کروں گی۔"

"بے غیرت! تجھے کتنی بار سمجھایا ہے کہ اونچے خواب مت دیکھا کر...اپنی اوقات میں رہا کر"۔

"اماں! کیوں میرا دل دکھاتی رہتی ہے ہر وقت...زندہ سلامت ہوں...اوروں کی طرح انسان ہوں۔تھوڑی سی الگ ہوں تو کیا ہوا..

بنایا تو مجھے بھی اللہ نے ہی ہے۔"

"دیکھ! مت ستایا کر خود کو"

"اماں! تیرا بس چلے تو...تو مجھے جینے بھی نہ دے۔"

"ارے! روئے گی بیٹھ کر"

"اماں! ایک بات تو بتا."

ماں نے اچٹتی نگاہ بیٹی پر ڈالی.

"اب کیا سوچ لیا تو نے؟"

"اماں! کیا میں عمر بھر ایسی ہی رہوں گی؟"

"اے اماں! بتا نا"

"سارے کہتے ہیں کہ میرا کچھ نہیں ہوسکتا."

"ہاں! ٹھیک ہی کہتے ہیں. جا! تیرا کچھ نہیں ہوسکتا"

"چل جا! چاچی کے گھر سے چھاج لے آ."

قینچی چپلوں میں پاؤں گھسا کر گھر کے باہر کے لکڑی کے دروازے پر لٹکے پردے کو زور سے پیچھے کیطرف دھکیلتی وہ کچی پگڈنڈی پر آئی تو دھول اڑاتی ایک گاڑی پاس سے گزر گئی. وہ آنکھوں کو ملتی رہ گئی.

"ہمارے گاؤں میں شہری گاڑی"۔

وہ بڑبڑاتی ہوئی چاچی کے گھر کی طرف ہولی۔

"چاچی! تیری بکری کے اب جو بچہ ہوا تو میں لونگی"۔

"ہاں ہاں تو ہی لینا... تو بھی تو اپنی بچی ہے."

"جا تیری ماں راہ دیکھتی ہوگی"۔

چھاج ہاتھ میں لیے جب وہ کچے راستے پر آئی تو نیم کے درخت کے نیچے جمع لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹھکی۔

"یہ چاچا رحیم کن لوگوں سے بات کر رہا ہے؟"

وہ خود سے ہمکلام ہوئی. اور نیم کے درخت کے نیچے آ پہنچی"۔

"سلام چاچا!" چارپائی پر بیٹھے پتلون شرٹ والے نوجوان کو غور سے دیکھتی رجو پر جب چاچے کی نظر پڑی تو فورا بھانپ گیا

"او... پتر! یہ شہر سے مہمان آیا ہے."

"کسانوں کو فصلوں کے بارے میں مفید مشورے دیتے ہیں اور دوائیاں بھی."

"چھوٹی ذرا گاڑی پر کپڑا لگا دو...راستے میں بہت مٹی دھول تھی."

"یہ چھوٹی کسے کہا تو نے.......بچی لگتی ہوں...میں تجھے؟"

"اوئے پتر! تو پھر بگڑ گئی."

چاچے نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے

اسے چپ کرانے کی کوشش کی. مگر وہ تو بپھری ہوئی کھڑی تھی.

"اوئے! جا جا کے اپنا کم کر."

"او جی! تسی اس جھلی کی باتوں کو دل پر مت لینا."

"چاچا! ان گاڑی والوں کے پاس گاڑی تو ہوتی ہے پر دل نہیں."

نوجوان حیرت سے کھڑا....غصے سے جاتی لڑکی کو دیکھتا رہ گیا.

"کہاں مر گئی تھی... چھاج لینے بھیجا تھا.

تجھے؟"

اماں کی نظر پڑتے ہی اس بچاری کی تو شامت آ گئی.

"اماں! شہر سے گاڑی میں مہمان آیا تھا. چاچے کے پاس."

"تو دیکھنے گئی تھی گاڑی کو؟"

اماں سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بھڑک اٹھی.

"اماں میں تو....." چمٹا کمر پر پڑتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے.

" ہزار بار منع کیا ہے کہ مت دیکھا کر گاڑیوں کے خواب.....بن باپ کی بیٹی ہے تو.....کوئی نہیں ہے تیرے لاڈ اٹھانے والا."

دونوں ماں بیٹیاں جب دل کی بھڑاس نکال چکیں تو اپنے اپنے کام میں لگ گیئں.

" بھر جائی.....رجو کو میرے ساتھ کر دے.شہر سے مہمان آرہے ہیں.ان کے لیے روٹی پانی کا بندوبست کرنا ہے."

اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے چینی تھی.

" جا چلی جا! چاچی کا ہاتھ بٹا."

" اچھا اماں!" دوپٹہ سنبھالتی وہ چاچی کے ساتھ چل دی.

ساگ گھوٹتے وہ کہیں اور ہی گم تھی.

" چاچی! میں کھانا دے آؤں چاچے کے ساتھ؟"

" ہاں کیوں نہیں...جا چلی جا."

روٹی کے رومال میں لپٹی مکئی کی روٹیاں

اور ساگ کا ڈونگہ اٹھائے وہ چاچے کے پیچھے چل رہی تھی.

" لو جی پتر! بسم اللہ کرو."

نوجوان نے آگے بڑھ کر چاچے کے ہاتھ سے لسی کا ڈول لے لیا.رجو پر نظر پڑی تو اس کی باتیں ذہن میں گردش کرنے لگیں.

" تم وہی ہونا بونی لڑکی؟"

ٹکٹکی باندھے جواب تک خاموش کھڑی تھی.سامان چار پائی پر رکھ کر وہ گاڑی کی طرف مڑی.

" رجو پتر! اوئے کچھ نہ کریں." چاچا گھبرا گیا.

اس نے اپنا دوپٹہ ہاتھوں میں لیا اور گاڑی کو صاف کرتے کرتے ایک نظر نوجوان پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے گھر کو چل دی.

" یہ... جھلی ہے جی.... کوئی نہیں اس بچاری کا... بس ماں کا سہارا ہے اسے."

" عجیب لڑکی ہے" نوجوان بڑبڑایا.

گھر میں داخل ہوتے ہی ماں کی نظر پڑی تو چونک گئی.

" تجھے کیوں چپ لگ گئی؟"

" لڑ کر آئی ہے کسی سے.... بول.. بتا تو سہی.... ہوا کیا ہے تجھے؟"

" یہ تو نصیب کی لڑائی ہے اماں"

اس کا تھکا ہوا لہجہ اس کی ماں کو مزید پریشان کر گیا.

" پاگل ہوگئی ہے کیا..... تیرے گاڑیوں کے خواب کہاں گئے؟"

" اماں! بڑی گاڑی والوں کے پاس بڑا دل نہیں ہوتا."

اس بار نیم کے اسی درخت کے نیچے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر نوجوان ٹھٹھکا.

" ارے جھلی تھی گاڑی کے خواب دیکھنے والی کہتی تھی..

" وڈی گاڑی والوں کے پاس وڈا دل نہیں ہوتا"

کان میں پڑتی چاچے رحیم کی باتیں اسے ویران کر گئیں.

نند کشور وکرم

تبصرہ

(کتابی سلسلہ ''ذوق'')

جب کبھی اُردو میں کسی جریدے کا آغاز ہوتا ہے تو میرے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اس جریدے/رسالے کو لمبی عمر نصیب ہو۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے اکثر چند شماروں کی اشاعت کے بعد ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں اٹک سے ''ذوق'' نام سے ایک کتابی سلسلے کا آغاز ہوا ہے جس کے مدیر اعلیٰ سید نصرت بخاری اور مدیر ارشد سیماب ملک ہیں جو ایک مدت سے تحقیق کی دنیا سے وابستہ ہیں اور جن کی اٹک سے متعلق دو کتابوں 'تذکرہ شعرائے اٹک' اور حال ہی میں شائع ہونے والی 'دستاویز' کو ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

جنوری ۲۰۱۹ء کا یہ شمارہ خوب صورت سرورق کے ساتھ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت تین سو روپے ہے۔ اس میں سیماب صاحب کا تحریر کردہ مضمون 'اُردو جریدہ نگاری اور تاریخ ساز رہنمائے تعلیم' ایک قابلِ قدر مضمون ہے جس میں گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصہ سے شائع ہو رہے۔ اس رسالہ اور اُن کے بانی مدیر ماسٹر جگت سنگھ اور فرزند ہر بھجن سنگھ تھاپر کے بارے میں اچھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ باقی مضامین بھی اپنے موضوعات کے حوالے سے معیاری ہیں۔ اس کے علاوہ ممتاز افسانہ نگار محمد حمید شاہد سے لیا گیا سید نصرت بخاری کا انٹرویو ''فکشن کے باب میں ایک مکالمہ'' بھی قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتا ہے اور اس کے مطالعے سے محمد حمید شاہد صاحب کے افسانوی فن اور فکشن سے متعلق اچھی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ یہ مکالمہ فکشن کو سمجھنے اور اس کے طالب

علموں کے لیے راہ مشعل ہے۔

ذوق کے اس شمارے میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی خوب صورت نعت اور غزلوں نظموں کے علاوہ فکشن پر آدھ درجن افسانے بھی شامل ہیں جن میں بشمول راقم، سید تحسین گیلانی، ہما فلک، صبا ممتاز بانو، خاور چودھری اور خالد قیوم تنولی ایسے افسانہ نگاروں کے تحریر کردہ ہیں۔ رسالے کی اُٹھان بہت اچھی ہے لہذا دعا کرنی چاہیے کہ یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری و ساری رہے اور اسے "تعطل" و "اختتام" ایسی صورت حال سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

پروفیسر وسیم حیدر

علمی وادبی مجلہ: ذوق

نصرت بخاری کی زیرِ ادارت اٹک سے شایع ہونے والا علمی و ادبی رسالہ " ذوق" اس مادہ پرستانہ دور میں تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ اداریہ بالترتیب نصرت بخاری اور ارشد سیماب ملک نے تحریر کیے ہیں۔ دونوں اصحاب نے احساسِ ذمہ داری کا مظاہرہ کرنے اور اور خالص ادب کی خدمت کرنے کے جذبے سے رسالے کا آغاز کیا ہے۔

حمد اور نعت کے بعد غزل اور نظم کا خوب صورت انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ مضامین میں " حکیم یوسف حضروی اور ان کا سفر سیرِ سوات" پر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کا تحقیقی مضمون خاصے کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر شمس القمر عاکف کا مقالہ " اردو غزل میں تعلی کی روایت" خوب صورت اور مفید مثالوں سے مزین ہے۔

مدیرِ اعلیٰ سید نصرت بخاری کا " فکشن کے باب میں ایک مکالمہ" " انٹرویو: محمد حمید شاہد" اس شمارہ کا حاصل ہے۔ مدیرِ اعلیٰ نے بڑے نپے تُلے سوالات کے ذریعے بہت سی ادبی گھتیاں سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور قاری کے ذہن میں اُٹھنے والے بہت سے ابہام دور کر دیے ہیں۔ ادب سے دل چسپی رکھنے والے قارئین کے لیے اس مکالمے میں افسانہ، غزل، نظم، تحقیق اور تنقید کے بنیادی اصول بیان کیے ہیں جو نئے لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

ادب کے طالب علم کے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کو نصرت بخاری نے جس خوب صورتی سے پیش کیا ہے، حمید شاہد نے مطالعہ کئی گنا زیادہ خوب صورتی سے جوابات دیے ہیں۔ یہ اُن کے مطالعہ اور اصنافِ سخن پر ان کی دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ افسانے کے باب میں تمام افسانے معیاری ہیں۔ اس سے اردو ادب میں افسانے کی اہمیت واضح ہو رہی ہے۔

176 کو صفحات کو محیط " ذوق" کے ایک ایک لفظ سے سید نصرت بخاری، مشتاق عاجز، ارشد سیماب ملک اور حسین امجد کی محنت اور لگن جھلک رہی ہے۔

شہزاد حسین بھٹی

ادبی مجلّے ذوق کا اجرا

ادب کی ترویج واشاعت میں جو کردار رسائل کا رہا ہے وہ کتاب کلچر یا دیگر ادبی سرگرمیوں سے کہیں بڑھ کے ہے۔خوش قسمتی سے اُردو میں بہت سے اہم جرائد و رسائل اس اہم ذمہ داری کو نبھاتے رہے ہیں۔رسائل کلچر اصل میں انگریز عہد میں آیا جب ادب کو ایک سماجی حقیقت کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ پریس نے برصغیر میں ایک نئ تخلیقی دنیا کا دروازہ کھول دیا۔نت نئے رسائل جاری ہونے لگے۔اخبارات اور کتابوں کی اشاعت نے ہماری سماجی اور تخلیقی زندگی پر بہت سے اثرات ڈالے۔اور یوں ادب بھی ان اثرات سے بہرہ مند ہونے لگا۔

یہ بات باعث اطمینان ہے کہ گذشتہ ایک دَہائی کے دوران اٹک جیسے پسماندہ ضلعے میں بھی لا تعداد پبلشنگ ہاؤسز قائم ہو گئے ہیں جو نہایت کامیابی کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کو کتابی شکل میں تشنگان علم کی پیاس بجھانے کا وظیفہ سرانجام دے رہے ہیں۔اس امر میں کوئی شک نہیں کہ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ تک رسائی کے باوجود کتاب بینی کی اہمیت مسلمہ ہے اور اس کی طرف مائل ہونا یقینا کتاب دوستی کو مرنے نہیں دے گا۔آئے روز اٹک کے طول وعرض سے نئ کتابوں اور مصنفین کی تعداد میں اضافہ خوش آئیند ہے جو آنے والی نسلوں کی راہنمائی و کردار سازی میں نمایاں کردار ادا کرے گا۔

"ذوق" کتابی سلسلہ (جنوری 2019ء) کا پہلا شمارہ اپنی جاذبیت،خوبصورتی اور فہرست مضامین کے اعتبار سے ضلع اٹک سے شائع ہونے والے ادبی مجلّات میں ممتاز

مقام اختیار کر گیا ہے، جسے ممتاز ادیب، شاعر و استاذ الاساتذہ مشتاق عاجز صاحب کی سرپرستی میں ضلع اٹک سے شائع کیا گیا ہے۔ اس مجلّے کے مدیر اعلیٰ کے فرائض پروفیسر نصرت بخاری سرانجام دے رہے ہیں جبکہ مدیر ارشد سیماب ملک و معاون مدیر حسین امجد ہیں۔ ایک سو چھہتر صفحات پر مشتمل اس خوبصورت ادبی مجلّے میں مجلس ادارت نے مضامینِ نو کے انبار لگا کر اسے حقیقی معنوں میں علم و ادب کا خرمن بنا دیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اُردو کے ضخیم ادبی مجلّات کی ہر سُو دھوم مچی تھی۔ ارد و ادب کی تاریخ میں فنون، اوراق، نقوش ، اقدار، افکار، ساقی، نیا دور ، زعفران، معیار اور کاروان کی علمی و ادبی خدمات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ان مجلّات کی پہچان ان کے ضخیم نمبر ہوا کرتے تھے اور ان کا ہر شمارہ اپنے مشمولات کی وجہ سے خاص شمارہ قرار پاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ یہ ضخیم مجلّات رہے اور نہ ہی ان کے عظیم مدیر سیلِ زماں کے تھپیڑوں میں سب کچھ بہہ گیا۔

ذوق کے مدیر اعلیٰ میرے عزیز دوست پروفیسر نصرت بخاری اُن اساتذہ میں سے ایک ہیں جنھوں نے تعلیم کو صرف پیشہ نہیں سمجھا کہ بس جو پڑھا ہے اسے ہی پچیس تیس سال پڑھانا ہے۔ انہوں نے اپنا تحصیل علم کا شوق نہ صرف جاری و ساری رکھا ہوا ہے بلکہ آئے روز اردو ادب میں ہونے والی نئی تحقیق سے اپنے طلباء کو بھی برابر سیراب کیئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایم فل کا تھیسز" مکاتیب مشاہیر بنام حق نواز خان" لکھا، اسکے بعد ان کا قلم پھر رکا نہیں، شاعری میں انکا مجموعہ کلام "سخن یہ ہے"، افسانوں پر کتاب" گھاؤ" جبکہ ضلع اٹک کی نمایاں شخصیات پر" شخصیات اٹک" شہرت کی بلندیوں کو چھو چکی ہے اور اسکے تین والیم شائع ہو چکے ہیں۔ اب تینوں والیم کو یکجا کر کے منصۂ شہود پر لا چکے ہیں۔

ذوق کے مدیر ارشد سیماب ملک کی شخصیت بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی کتاب" تذکرہ شعراء اٹک "2012ء میں چھپ کر ادبی حلقوں میں جگہ بنا چکی ہے۔

یہی نہیں بلکہ ضلع اٹک کے افسانہ نگاروں پر انکی تحقیقی کتاب" دستاویز" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ذوق کے معاون مدیر حسین امجد شاعری کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ذوق کا پہلا شمارہ نصرت بخاری صاحب نے میرے دوست اقبال زرقاش کے توسط سے مجھے بھجوایا جبکہ ارشد سیماب ملک نے بھی مجھے بذریعہ ڈاک بھجوا کر شکریے کا موقع عطا کیا۔خوبصورت لے آؤٹ سے مزین ضخیم شمارہ تحصیل علم کے متلاشیوں کو نہ صرف سیراب کرے گا بلکہ ان کی قدم بہ قدم راہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دے گا۔ اس مجلّے کے مضامین کے انتخاب میں اسکے نام کی لاج رکھتے ہوئے نہایت چھانٹ پھٹک اورعرق ریزی دیکھائی گئی ہے تا کہ اس میں شامل علمی و تحقیقی مواد اسے باذوق لوگوں اور عمدہ معیاری مجلّات کی صف میں جگہ بنانے میں معاون ہو۔

اس مجلّے کی ورق گردانی سے یہ ادراک ہوا کہ یہ مجلہ پاک وہند کے کسی بھی حصے سے شائع ہونے والے ادبی مجلّے سے معیار اور مندرجات کے حوالے سے کم نہ ہے۔حمد، نعت،غزلیات،مضامین،تحقیق،تنقید،مکالمہ،افسانے اورافسانچے تک ہر صنف ادب شامل مجلہ ہے۔مضامین میں ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد صاحب کا" حکیم یوسف حضروی اور اُن کا سفر سیرِ سوات" ارشد سیماب ملک کا" اُردو جریدہ نگاری اور تاریخ ساز رہنمائے تعلیم" پروفیسر نصرت بخاری کا" فکشن کے باب میں ایک مکالمہ" نامور فکشن نگار، نقاد محمد حمید شاہد کے انٹرویو پر مبنی ہے۔اس انٹرویو میں محمد حمید شاہد صاحب نے نہایت سہل پیرائیوں میں فکشن نگاری کو تاریخی حوالوں سے بیان کیا ہے اور افسانوں میں نند کشور وکرم کا افسانہ" کابلی والا کی واپسی"، خالد قیوم تنولی کا" اِک چراغِ رُخ زیبا" اور صبا ممتاز بانو کا" آزادی" خاصے کی چیز ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔غرض اس شمارے میں تمام اصناف ادب کی چاشنی موجود ہے۔البتہ ناول(اقساط میں)،ناولیٹ، تنقید،کالم،خاکہ، انشائیہ، کہانی،

داستان/ قصہ، ڈراما، سفرنامہ اور سوانح حیات کو آمدہ شماروں میں باقاعدگی سے شامل کر لیا جائے تو یہ تمام اصناف ادب کے قاریوں کے لیے ادبی گلدستہ بن جائے گا۔ آخر میں اللہ پاک سے دُعا گو ہوں کہ پروفیسر نصرت بخاری کا لگایا یہ پودا ایک دن مضبوط اور توانا درخت بن جائے اور ہر آنے والے مسافر کو ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرے۔ امین

(روزنامہ ایشین نیوز اسلام آباد، ایڈیٹر: ڈاکٹر عبدالودود قریشی، 3/ اپریل 2019ء)

رومان پرور شاعر حسین امجد کا

دوسرا شعری مجموعہ

گنگناتے سُر

عنقریب شائع ہو رہا ہے

ذوق پبلی کیشن، اٹک رابطہ نمبر 0313-4749191

شخصیاتِ اٹک

تحقیق: سید نصرت بخاری

صفحات: 346

قیمت: -/550 روپے

ذوق پبلی کیشن، اٹک رابطہ نمبر 0313-4749191

Established : 1930 Telephone : 35 99 04

The

SHAIR — MOST POPULAR URDU MONTHLY — شاعر

"QASR-UL-ADAB"
Post Box No. 4526, Bombay-400 008

۲۳ر اگست ۱۹۸۲ء

محترمی احمد داؤد صاحب ۔ سلام مسنون

بہت عرصے کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں ۔ غالباً دشمن دار آدمی کی رسید
بھی نہیں دے سکا ہوں ۔ کتاب کے لیے بے حد شکر گزار ہوں ۔

پاکستان میں اردو ادب نمبر کو بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیے تھا
لیکن چونکہ میں اس کے خاکے سے مطمئن نہیں تھا ، پھر میں گزشتہ دو برسوں
میں بے حد مریض رہا اور بے طرح مصروف بھی اس لیے خاص نمبر کا کام ادھورا
پڑا رہا ۔ اسی دوران میں چار سو صفحات کا ہنگامہ خیز نثری نظم اور آزاد غزل نمبر
شائع کیا جو مجھے بہت دور تک اپنے ساتھ لے گیا ۔

پاکستان میں اردو ادب نمبر کا اب جو خاکہ مرتب ہوا ہے وہ اتنا جاندار
اور منفرد ہے کہ اردو زبان و ادب کی ایک مبسوط تاریخ بن جائے گا ۔ نمبر
کے سلسلے میں از سر نو خط و کتابت کا سلسلہ جلد ہی شروع ہو گا ۔ آپ نے
ازراہ خلوص جو مجھے تعاون دیا تھا اس کا میں بے حد ممنون ہوں اور اب آئندہ
بھی آپ سے اسی طرح کے پُر خلوص تعاون کی امید رکھتا ہوں ۔ آپ نے جو
مجھے دوسرے قلمکاروں کی تخلیقات ارسال کی تھیں اس کی تفصیل آئندہ
خط میں لکھوں گا ۔

شاعر اب نئی تبدیلیوں کے ساتھ بہت جلد آفسٹ پر شائع ہونے والا ہے
اس کے ابتدائی شمارے کے لیے کوئی غیر مطبوعہ تازہ افسانہ فوری طور پر
ارسال کیجیے ۔

آپ کے خط کا انتظار رہے گا ۔ احباب سے سلام عرض کیجیے گا ۔
امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے ۔

نیاز مند

افتخار امام

پیارے داؤد

سلام۔ یار تیری چٹھی سے یاد کیا ہے۔ بہت مسرت ہوئی ہے۔
یار اس دن بہت اداسی ہوئی۔ یک بیک یوں غائب ہو جانا۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا
پھر اتنی مشکل سے ہم ہاتھ لگے تھے۔ بہرحال یہ بات درست ہے کہ وہ گروہ کوئی
قابل اعتماد لوگوں کا نہیں تھا۔

میں اس کتاب کے لیے بے حد ممنون ہوں گا۔ اگر وہ کتاب آپ نے Post نہیں کی
تو درج ذیل پتے پر پوسٹ کریں۔ اگر شکر گزار ہو کر چکے ہیں تب بھی خط سے کوئی
بات نہیں مل جائے گی۔

میں ضرور مضمون لکھوں گا۔ یہ ضرور بتا دینا کہ تقریب میں پڑھنے کے لیے ہے یا کسی
رسالے میں اشاعت کے واسطے۔ اور دس دن لکھنے کے لیے ضرور دینا۔ کیونکہ میں روا روی
میں کبھی نہیں لکھ سکتا۔ میں ہر طرح تیار ہوں چاہے تقریب میں آ کر پڑھنا ہی کیوں نہ پڑے۔
خالد سعید صاحب کی بحالی کی مبارک ہو۔
نظمیں نقل کر کے بھجوا دوں گا۔ مسعود صدیقی، رشید امجد، اعجاز راہی اور دیگر احباب
کو سلام کہیں۔
خط ضرور لکھنا۔ کتاب ملنے پر اطلاع دوں گا۔

تمہارا
[illegible]

لاہور کا پتہ کتاب بھیجنے کے لیے
آشیانہ
تھری پارک۔ سانده خورد
سانده روڈ
لاہور

فون: ۸۳۷۲۱

فردا پبلیکیشنز

بی/۳۶۵- سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ

برادرِ عزیز

اگر کوئی تازہ، اور غیر مطبوعہ کہانی آپ کے پاس ہو تو واپسی ڈاک بھجوا دیں تاکہ میں اسے "فردا" کی زیرِ ترتیب اولین اشاعت میں شامل کر سکوں۔

عالمی ادب سے نمائندہ تحریروں کا انتخاب بھی سلسلہ میں اس بار شروع کیا ہے۔ اگر احمد شمیم مرحوم کی پانچ / چھ منتخب نظمیں مل جائیں تو بھیج دیں۔ ان کی بیگم تک میری طرف سے تعزیت بھی پہنچا دیں۔

امید ہے آپ مع احباب بخیر و عافیت ہوں گے

اختر حسین جعفری

۲۱ اکتوبر ۸۳ء

HOSHIARPUR
28.9.82.

پیارے ہمراز داؤد!

سلام۔

عید مبارک ہووے۔ ویسے تاں میرا اک شعر ہے

ایہہ کیسی عید چن چڑھیا نہ دسیا
میرا سگتّا تے نگن ہیرا۔

(سگتّا دا مطلب ہے خیال)۔ بہر حال۔۔۔۔ تیرا ناولٹ لبھتی بہت پسند آیا۔ پر اسدا
ناں کجھ ہور چاہیدا اے۔ سہ ماہی سویرا وچ وی کسے دا ناولٹ چھپیا سی تے اُسدا
ناں سیھم لبھتی سی۔ دسمبر جاں جنوری وچ اسدا ترجمہ پنجابی وچ کراں گا تے ایدھر
کسے پنجابی ماہنامہ وچ چھپ دی جاوے گا۔ اج کل میں مظہر الاسلام دیاں کہانیاں
پنجابی وچ ترجمہ کر رہیا داں۔ 10/12 ترجمہ ہو جان گیاں تاں کسے ویلے کتابی صورت
وچ چھپوا دیاں گا۔
میں دیروں دا امریکہ توں آیاں، کوئی کم جم نہیں کر سکیا کیونکہ مینوں
موسمی بخار (ملیریا) دبا لیا سی۔ اجے وی کمزوری آں۔ کالج وی نہیں جاندا
ایسے لئی اسحاق صاحب بارے مضمون نہیں لکھ سکیا۔ ہور وی بڑے کم پئے نے۔
کیس اپنیاں (نوں) نویاں کہانیاں کدوں تیک بھیج رہیا ایں۔ جے کوئی ستّا ودھیا!
ناول اک ادھ سال وچ کسے دا چھپیا اے تے ضرور ارسال کر۔
میں اگلے سال کوشش کراں گا کہ پاکستان آ سکاں۔ پر ایہہ تاں ایں
ممکن ایں جے ویزا مل سکے گا۔ مینوں کسے دی ملک دا ویزا لین وچ کدے دشواری
نہیں آئی پر پاکستان دا ویزا لین وچ آدمی بڈھا ہو جاندا اے۔
کیس خط دا جواب جلدی دے دیا کر۔ میری ولوں مظہر الاسلام، افضل پرویز،
احمد ظفر، راشد رانا تے سب دوستاں نوں سلام آکھنا۔
تیری بچی نوں پیار۔ بیگم نوں سلام تے گھر والیاں نوں آداب۔

؎ تیرا دادا دل تاں مزاریاں درگاہ وی ہیں۔ اج اوہ جاگیردار ضرور اے۔ پر اج
دی اوہ اپنا فائدہ سدا اُسدا رکھدا اے۔ عبدالکریم قدسی دا اک شعر سانجھ دے
اج دے معاشرے تے دوستی آں دا چنگا ترجمان اے۔

؎ ایہہ یاریاں دی غرضاں دے تبادلے
غرضاں نے ایہہ پاک جذبہ پلیت کیتا
اسیں دوستی ناں غرضاں دا تبادلہ وی ویر کردے آں۔

تیرا
جگتار

ج۔

Prof. Jagtar Singh
Deptt. of Punjabi
Govt. College, Hushiarpur

جگتار
کمال پورہ گلی نمبر ۳ مکان نمبر ۵۶ ہوشیارپور

پیارے داؤد۔

سلام!

اللہ تمہاری عمر دراز کرے اور تم ہزاروں برس زندگی جیو۔ تم نے مجھے بزرگوار لکھ کر نسبت سے رشتوں اور الفاظ کی شکل بدل دی۔ یعنی دوستا سے برخوردار اور آپ سے تم بن گئے۔

بردہ کتب میں ایک کتاب محترمہ امرتا کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ارسال کر دی ہے اور ساتھ ہی ان کا پتہ بھی ارسال کر دیا ہے۔ آپ کی کتاب 24.6.83 کو ملی تھی اور 26.6.83 کو ختم کر دی۔ یہ کہانیاں مجھے بہت ہی پسند ہیں اور میرے نقطہ نظر میں پوری ترقی پسند ہیں۔ ان میں دشمن دار آدمی، بیچ دینے والے، تبدیلی منزل قدیم بوڑھا پوری بات اور منحوس منظر کے لیے بددعا شامل ہیں۔

ان افسانوں میں افسانے کا پہلو بھی شامل ہے اور کرداروں میں اساطیری اوصاف بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔ عام سے کرداروں کو اساطیری اوصاف کا بخشنا بہت بڑے فنکار کا حصہ ہوتا ہے۔ بیچ دینے والا۔ ایک ایسی ترقی پسندی کی حامل کہانی ہے جو پچھلے 30/40 برسوں میں لکھی گئی اردو کہانیوں میں صف اول کی کہانی کہلا سکتی ہے اور جس میں Regimentation یا نعرہ بازی کا دخل تک نہیں اور استعارہ بھی بہت ہی جامع اور concrete ہے۔ یہی بات دشمن دار آدمی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

ان کہانیوں میں پرانی کہانیوں کی طرح کوئی مرکزی کردار نہیں لیکن ایک مرکز ضرور ہے جس کے گرد کردار اپنی معنویت اور اہمیت پیش کرتے ہیں۔

کہیں کہیں پنجابی زبان کے پیوند تمہاری کہانیوں کے لباس پر کشیدہ کاری کا کام انجام دے رہے ہیں نانمایاں نہیں لگتے۔

سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ تم نے ان کہانیوں میں داخلی منفرد احساس اور عالم کو خارجی زندگی اور دنیا سے الگ نہیں ہونے دیا۔ اس طرح ان کہانیوں کی وسعت میں داخلی اور خارجی ٹکراؤ کی ہم آہنگی کی وجہ سے ایک ایسا عالم اور کائنات پیدا ہو گئی ہیں جو بے کراں بھی ہے اور لامحدود بھی۔ اس طرح ان افسانوں کے معنوی پہلو پرت دار بن گئے ہیں۔

میں نے امرتا جی کو خط لکھا ہے میں احمد داؤد کی سات کہانیاں ترجمہ کر کے ارسال کر دوں تاکہ وہ کسی شمارہ میں ایک ساتھ سات کہانیاں شائع کر دیں۔

منظر الاسلام اور محمد منشا یاد کی سات سات کہانیاں ناگ منی میں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ اعجاز راہی، مستنصر حسین تارڑ اور دوسرے لوگوں کے مجموعے ارسال کر دیں۔ میں ترجمہ کر دوں گا اور کہانیاں بھی چھپ جائیں گی۔ داؤد بھائی اردو کے بہت کم مجموعے (نظم اور نثر) ہمیں دستیاب آتے ہیں۔ اگر آپ بھجوا سکیں تو بہت ممنون ہوں گا۔ کتابیں بھجوانے پر خرچ ضرور آتا ہے لیکن فائدہ بھی بہت ہے۔ ادھر کے قارئین آپ کے تخلیقی عمل سے واقف ہو جاتے ہیں۔

جناب راشد حسن رانا، منظر الاسلام، محمود نیئر، افضل پرویز، جبار میرزا، منیر محمد ملک صاحب اور دیگر دوستوں کو سلام۔

گھر والوں کو آداب۔ بچی کو بہت بہت پیار۔ بیگم کو سلام۔

تمہارا اپنا
دلشاد

دوسرا خط بھیجا ہے، ضرور دیکھ لیں

Amrita Pritam
Editor Nag Mani
25-K- Hauz Khas N. DELHI

18/11/83

برادرم داؤد صاحب

مزاج گرامی۔

امید ہے آپ خیریت سے ہیں۔ مجھے اسلام آباد سے یک لخت لاہور واپس ہونا پڑا۔ وجہ بیماری تھی۔ اسلام آباد کے ڈاکٹرز نے کہا کہ الرجی ہے، کسی نے کہا خفیف سا لقوہ ہے۔ لاہور آ کر Sinusitis تشخیص ہوا۔

آپ کی دو کتابیں برادرم حسن ناگی (ٹیلی) 29664 42-F Masjid Road پر ہیں۔ انہیں ٹیلیفون کریں۔ اس زحمت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

ملیں اگر آپ کا ادارہ شورش سعودی کی تحریکوں پر کتاب کے بارے میں دلچسپی کا حامل ہے تو لکھیں۔

شکریہ۔

مخلص

انیس ناگی

Tele: 321047

22 Ganga Ram Mansion

Mall Road, Lahore

66 ج
ماڈل ٹاؤن، لاہور۔

عزیزم احمد داؤد

السلام علیکم۔ آپ کی کہانی مل گئی۔ میں تو اب مایوس ہو چلا تھا۔ مگر یہ کہانی مل جانے سے گویا سوکھے دھانوں میں پانی آ گیا۔ اسی وقت اس کی نقل بنوائی اور اپنے انتخاب میں شامل کر لی۔

آپ نے اپنی کہانی کے بارے میں رائے پوچھی ہے تو اتنا لکھ دینا ہی کافی ہے کہ میں نے کسی افسانہ نگار کی کہانی کا انتخاب اس کی ایک ہی کہانی پڑھ کر نہیں کیا۔ جس کی پوری کتاب سامنے نہیں تھی اس سے کم از کم تین کہانیاں منگوا کر دیکھیں۔ پھر ایک کہانی کا انتخاب کیا۔ اس میں میری طرف سے کسی مروت کو ہرگز کوئی دخل نہیں۔ یہ کہانی ہی مجھے بہت پسند آئی۔ کچھ تو آپ کا انداز دلپذیر ہے اور کچھ علامتی انداز میرے دل کے بھی قریب ہے۔ میں نے بھی جو "چھلکے میں" تین اردو افسانے لکھے ہیں انہیں علامت ہی کا prop دے کر ان کا قد بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

آپ کے بارے میں اور آپ کی کہانی کے بارے میں جو چھوٹا سا نوٹ میں نے اس anthology کے لئے لکھا ہے، وہ آپ کتاب چھپنے پر خود ہی پڑھ لیں گے۔ تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ امید ہے آپ پسند کریں گے۔

اب میری یہ گزارش ہے کہ آپ مجھے یہ خط ملتے ہی اپنے بارے میں کوائف لکھ کر بھجوا دیں:

۱۔ تاریخ پیدائش
۲۔ تعلیم
۳۔ کاروروزگار
۴۔ تصنیف
۵۔ پتہ

آئندہ اسلام آباد آیا تو ضرور ملاقات کیلئے حاضر ہوں گا۔ آپ کا ٹیلیفون نمبر نوٹ کر لیا ہے۔

آپ کی خوشی اور خیریت کا خواہاں
سجاد حیدر

اُردو افسانہ

~~ڈی-۱ فلک نما فلیٹس، یونیورسٹی روڈ، کراچی-۲۴~~

A-36 واحد اسکوائر - بلاک ۱۶ گلشن اقبال - کراچی ۴۷

۹ مئی ۸۱ء

مائی ڈیر احمد داؤد

سلام مسنون - توقع ہے تم خیریت سے ہوگے۔ مہینوں سے خط و کتابت نہیں ہوئی خیریت سے تو ہو نا؟ تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے "منظر پبلیکیشنز" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر لیا ہے جو کتابیں شائع کرنے کے علاوہ کتابیں اور رسائل تقسیم بھی کیا کرے گا اور ملک کے مختلف حصوں سے شائع ہونے والی کتابوں کی تقسیم اور ترسیل کا کام بھی انجام دے گا۔ اس ضمن میں تمہاری اور دوسرے ادیب کے تعاون کی توقع ہے۔ کاروبار بہت ہی چھوٹے پیمانے سے شروع کیا ہے اور [illegible] دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ اگر تم اپنی کتاب [illegible] کی دس کاپیاں ارسال کردو تو میں اسے فروخت کر کے کمیشن منہا کر کے اصل قیمت بذریعہ چیک یا منی آرڈر ارسال کر دوں گا اور مزید کتابیں بھیجنے کا آرڈر دے دوں گا۔ ادھر دونوں مصنفین اپنی کتابیں خود شائع کر رہے ہیں ان کی فروخت اور تقسیم مسئلہ بنا رہتا ہے اسی لئے میں نے یہ کام شروع کیا ہے تاکہ احباب کی کتابیں فروخت بھی ہوں اور مجھے بھی دو پیسے حاصل ہو جائیں۔ توقع ہے تم اولین فرصت میں اپنی کتابیں بذریعہ رجسٹری ارسال کرو گے۔

• جواز میں تمہارا ناولٹ نظر سے گزرا اسے پڑھ کر [illegible] ہوا ہے۔ رسالہ دوستوں میں گشت کر رہا ہے۔ تم کراچی کب آ رہے ہو۔ حامد بیگ کی دس عدد کتابیں میں فروخت کر چکا ہوں۔ اس ضمن میں رشید امجد کو الگ سے لکھ رہا ہوں۔ یار! کبھی تو چند دنوں کے لئے کراچی آؤ۔ لطف رہے گا۔

فقط

تمہارا دوست

شہزاد منظر

مزید یہ کہ نئے پتے پر خط و کتابت کرنا۔ پتہ اوپر درج ہے

ش۔م

اس سے پہلے "انا ہیگا"، "جب اندھیرا ہوتا ہے"، "سوال" وغیرہ ریلیز ہو چکی ہیں۔

لیکن انا ہیگا اور وِجے کے علاوہ کوئی فلم کامیاب نہیں کہی جا سکتی۔

یہ سب کچھ نہیں — روزی روٹی چلانے کا دھندہ ہے۔ اِن میں تخلیقی کام کچھ نہیں ہوتا

اور نہ ہی تخلیقی ذہن کی ضرورت ہے — سب نقالی ہوتی ہے۔

یہ مشقت اس شخص کو زندہ رکھنے کیلئے ہے۔ جو افسانے لکھتا ہے۔

ایک اچھا کام ضرور کیا تھا۔ کہ T.V کیلئے ایک سیریل لکھا تھا خزانہ۔

جو دنیا کی بہترین کہانیوں پر Based تھا۔ جسے یش چوپڑہ نے پروڈیوس کیا تھا۔

زیادہ خیریت۔ دوستوں کو سلام و محبت۔

میری زندگی کے حالات آپ تک کیا پہنچے ہیں؟ ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔

آپکا صادق۔

فضیل صاحب سے ملاقات ہوئی تو آپ کی تصنیفات کے بارے میں معلوم کروں گا۔

Established : 1930
The
SHAIR — MOST POPULAR URDU MONTHLY
شاعر
Telephone : 35 9 9 0 4
"QASR-UL-ADAB"
Post Box No. 4526, Bombay-400 008

شاعر کے حالیہ شمارے کم ہونے کے سبب
ارسال کرنے سے معذور ہوں ۔ نیا
شمارہ پریس میں ہے
افتخار

۱۷ نومبر ۱۹۸۴ء

برادرم [illegible] ——— سلامِ مسنون

بہت عرصے کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں جس کے لئے بے حد معذرت خواہ ہوں ۔ اس درمیان
میں نہ صرف یہ کہ بے حد پریشان ، الجھا ہوا اور جسمانی بیماری میں گرفتار رہا ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ غالباً
میں نے آپ کی کتاب "دشمن دار آدمی" کی رسید دیدی تھی ۔ پھر ابھی حال ہی میں آپ کی
ایک اور کتاب "نثری نظمیں" موصول ہوئی تھی جس کے لئے بے حد شکر گزار ہوں ۔
شاعر کا نثری نظم اور آزاد غزل نمبر شائع ہونے کے بعد میں نے ایک
کاپی آپ کے لئے بھی ارسال کی تھی لیکن وہ شمارہ کسی اور کو دے دیا گیا
جس کا خود مجھے بھی افسوس ہے ۔
شاعر کے چند شمارے اور نثری نظم اور آزاد غزل نمبر کی ایک کاپی آپ
کے لئے ہے ، قبول کیجئے ۔ اور اپنی گرانقدر رائے سے نوازیے ۔
جنوری ۱۹۸۵ء سے شاعر اپنی اشاعت کے ۵۶ویں سال میں داخل
ہو رہا ہے ۔ نئے سال کے پہلے شمارے سے شاعر نئی تبدیلیوں اور اضافوں کے
ساتھ نئے ڈھنگ سے شائع ہو رہا ہے ۔ میں اب شاعر کو اور زیادہ معیاری ، متنوع ،
دلچسپ اور پوری اردو دنیا کے لئے رابطے کا رسالہ بنا دینا چاہتا ہوں ۔
جنوری ۱۹۸۵ء کا شمارہ ایک تجرباتی خاص نمبر ہوگا ۔ روایتی
اور فرسودہ خاص نمبروں سے مختلف ۔ میں اس تجرباتی شمارے کے لئے
بطورِ خاص نئے ادبی غیر مطبوعہ افسانے کی درخواست کر رہا ہوں ۔ آپ جلد
از جلد نگارشات ارسال کیجئے ۔
پاکستان میں اردو ادب نمبر کا اب جو خاکہ بنا ہے وہ ایک ادبی تاریخی دستاویز
بن جائے گا ۔ بہت زیادہ محنت طلب کام بن گیا ہے ۔ شاعر کے تجرباتی خاص نمبر
میں اس کا اعلان دے رہا ہوں ۔ اس نمبر کے لئے پاکستان کا سفر ناگزیر
ہو گیا ہے ۔ حالات موافق ہوئے تو پھر بھی مارچ اپریل تک سفر کا ارادہ ہے ۔
جنوری سے باقاعدہ شاعر بھجوانے کی کوشش کروں گا ۔
میرا خیال ہے کہ اب یہ مراسلت برابر جاری رہنی چاہیئے ۔
شاعر کے لئے علمی ، ادبی ، تہذیبی خبریں ، اگر ہو سکے ارسال کیجئے
میں شاعر میں ایک نیا سلسلہ "اردو کا عالمی منظر نامہ" شروع کر رہا
ہوں اس کے لئے آپ سے بھی تعاون کی درخواست ہے ۔

ایک بات یہ بھی ذہن نشین رہے
آپ وہاں لکھ کر رسائل کے
لئے جو بھی ارسال کرتے ہیں
وہ شاعر کے لئے
بھی ارسال کر دیں
آپ سے خط و کتابت کا
سلسلہ رہے گا
امید کہ مزاج بخیر
ہوگا

آپ کا
افتخار امام